جلد ۱۳۳ ماہ رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۴ء عدد ۶

مضامین

شذرات

۱۲ مئی ۱۹۸۲ء کو ہندوستان کے نامور عالم مولانا مفتی عتیق الرحمٰن فالج کے موذی مرض میں ایک طویل مدت تک مبتلا رہ کر ۸۱ سال کی عمر میں اس دارِ فانی سے رحلت گرائے عالم جاودانی ہوئے، ان کے اس مرض کی ابتدا کی داستان دار المصنفین سے بھی بڑی حد تک وابستہ ہے، اس لئے اس ادارہ کے خدام ان کی وفات حسرت آیات سے بہت سوگوار ہیں، فروری ۱۹۸۰ء میں یہاں اسلام اور مستشرقین پر جو سمینار ہوا تھا اس میں وہ شرکت کے لئے تشریف لائے تھے، تین روز یہاں بہت ہنسی خوشی سے گذارے، اس کے ایک اجلاس کی صدارت بھی کی، خوش خوش یہاں سے اور شرکا کے ساتھ روانہ ہوئے تو ریل ہی میں بارہ بنکی کے پاس اُن پر فالج کا سخت حملہ ہوا، ان کے ہم سفر مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا سجاد حسین نے ان کو کسی طرح لکھنؤ کے ہسپتال میں داخل کیا، ان کی طبیعت کچھ سنبھلی تو پھر دلی لے جائے گئے، اس وقت سے اپنی وفات تک تقریباً سوا دو سال تک بستر ہی پر رہے، خیال ہوتا ہے کہ وہ دار المصنفین کا سفر نہ کرتے تو اس موذی مرض میں مبتلا نہ ہوتے، مگر مشیتِ ایزدی یہی تھی، راقم ان کی عیادت کے لئے کئی بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کا جسم تو بیکار ہو چکا تھا، مگر دماغ بیدار رہا، گفتگو میں وہی روانی اور شیرینی ہوتی جو اُن کی طبیعت کا مخصوص رنگ تھا، ہر قسم کے مسائل پر گفتگو کرتے، مگر زیادہ تر دار العلوم دیوبند کے قضیۂ نامرضیہ پر اظہار خیال کرتے، ایسا معلوم ہوتا کہ وہاں کا المیہ پیش نہ آتا تو اس مرض میں مبتلا نہ ہوتے اور ہوتے بھی تو اتنے دنوں تک بستر علالت پر پڑے نہ رہتے، دار العلوم دیوبند سے ان کا لگاؤ فطری تھا، کیونکہ ان کے جد امجد مولانا فضل الرحمٰنؒ اس کے بانیوں میں سے تھے،

ان کی زندگی ان کے گوناگوں مشاغل سے معمور رہی، دار العلوم دیوبند کے ان علما میں شمار کئے جاتے جن پر بجا طور سے اس کو فخر ہو سکتا ہے، دیوبند اور ڈابھیل کے مدرسوں میں کچھ دنوں درس و

افتاء کی خدمت انجام دی، پھر کلکتہ کی کولوٹولا اسٹریٹ کی بڑی مسجد کے خطیب رہے، جہاں اپنے درس قرآن سے بھی لوگوں کو مستفیض کیا، وہاں سے دلی آکر ندوۃ المصنفین قائم کیا اور اسی کو حرزِ جاں بنا کر اپنی پوری زندگی گذار دی،

سیاست میں بھی برابر حصہ لیتے رہے، بڑے خوش بیان مقرر تھے، ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے کے لئے انڈین نیشنل کانگریس کے جانباز سپاہی بنے تو اپنی وضع داری میں آخر وقت تک اس کے ساتھ رہے، مگر وہ ان کانگریسی مسلمان رہنماؤں میں نہ تھے جو ہندوؤں اور حکومت میں تو بہت محبوب سمجھے جاتے ہیں لیکن اپنے ہم مذہبوں میں معتوب ہوتے ہیں، اُن کا سیاسی ذہن بہت صاف تھا، اس لئے غیر کانگریسی رہنماؤں سے بھی ان کا میل ملاپ رہا، ان سے اپنے تعلقات کے آبگینے میں کسی قسم کی ٹھیس لگنے کو پسند نہ کرتے، اونچے خاندان کے چشم و چراغ تھے، اس لئے خاندانی وراثت میں جو اوصاف پائے تھے، ان کو اپنی سیاسی زندگی میں بھی برقرار رکھا، اپنے معاصروں سے بہت ہی محبانہ طور پر ملتے، خواہ ان کا سیاسی مسلک کچھ بھی ہوتا، اپنے چھوٹوں سے مربیانہ انداز کی گفتگو کر کے ان کے دلوں کو موہ لیتے، اپنے ناقدوں بلکہ مخالفوں سے بھی شریفانہ برتاؤ رکھتے، ان کی ان خوبیوں کی وجہ سے مجلسِ مشاورت کے اربابِ حل و عقد نے ان کو اس کا صدر بنایا، تو آخر وقت تک وہ اس منصب پر قائم رہے، مگر ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمان کچھ ایسے غیر متحرک ہو گئے ہیں کہ ان کا جمود ختم ہوتا نظر نہیں آتا، اس لئے مجلسِ مشاورت میں بھی وہ حرکت پیدا نہ ہو سکی جس کی توقع کی جا سکتی تھی، اس کا افسوس عام مسلمانوں کے ساتھ خود مولانائے مرحوم کو بھی رہا،

ان پر جہاں عام مسلمانوں کو اپنے ملی معاملات میں اعتماد رہا، وہاں حکومت ہند کو بھی ان کے وطنی جذبہ پر پورا بھروسہ رہا، ملک کے دینی مدرسوں، علمی انجمنوں اور علمی تحریکوں میں ان کی رکنیت اور شمولیت باعثِ فخر سمجھی جاتی، اسی طرح حکومت کی بعض اہم کمیٹیوں کے بھی رکن رہے اور کبھی بیرونی وفود میں حکومت کی نمائندگی بھی کی، دینی، علمی اور سیاسی مجلسوں میں اپنی خطیبانہ شان سے اثر انداز ہوتے، اور ان کے مخلصانہ مشوروں کی قدر کی جاتی،

ان کا زندہ جاوید کارنامہ ندوۃ المصنفین ہے جس کی تاسیس انھوں نے ملک کے مشکل حالات اور اردو زبان کے صبر آزما احوال میں ۱۹۳۸ء میں کی، اس وقت سے اب تک اس کی طرف سے تقریباً دو سو کتابیں مذہب، تفسیر، حدیث، تاریخ، سیاسیات،

اور دوسرے علوم و فنون پر دیدہ زیب کتابت طباعت بڑی اچھی جلد اور گرد پوش سے شائع ہوچکی ہیں، ان سے اردو لٹریچر میں بڑا وزن اور وقار پیدا ہوگیا ہے، نشر و اشاعت کا ادارہ قائم کرنا اور اس کے معیار کو برقرار رکھکر مقبولِ عوام و خواص بنانا صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا، مگر مولانائے مرحوم نے اس جوئے شیر کو رواں رکھنے میں اپنی پوری زندگی گذار دی، اردو کے علم و فن کی تاریخ میں ان کا یہ کارنامہ ہمیشہ یادر کھا جائے گا،

وہ خود تو بہت سی کتابوں کے مصنف نہیں ہوئے، انھوں نے شروع میں علامہ ابن تیمیہ کی الکلم الطیب پر تشریحی نوٹ لکھے اور علامہ ابن جوزی کی صید الخاطر کا ترجمہ بھی اردو میں کیا، قرآن مجید کی مختصر تفسیر دو جلدوں میں لکھنی چاہتے تھے لیکن لکھ نہ سکے، ان کی ریڈیائی تقریروں کا ایک مجموعہ منارۂ صدا کے نام سے شائع ہوا ہے، وہ جیسی میٹھی گفتگو کرتے ویسی ہی میٹھی تحریر بھی لکھتے، اپنے سیاسی مشاغل اور ندوۃ المصنفین کے اہتمام کے خرخشوں کی وجہ سے خود تو بہت سی کتابوں کے مصنف نہ بن سکے لیکن مصنف گر ضرور رہے، ان کے ادارہ کی وجہ سے بہت سے اہل قلم مصنف بن گئے اور ان کی دبی صلاحیتیں ابھریں، ورنہ یہ دبی رہ جاتیں تو علوم و فنون کا کتنا بڑا نقصان ہوتا،

ندوۃ المصنفین کا ترجمان مجلہ برہان ہے جو جولائی سنہ ۱۹۳۸ء سے اب تک ہر مہینہ بڑی پابندی سے نکل رہا ہے اس کی قلمی گلکاریوں، ادبی زمزمہ سنجیوں، مذہبی موشگافیوں، علمی نکتہ آفرینیوں اور اس کے مختلف مضامین کی مشاطگی کی کاوشوں کا زریں سہرا تو مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے سر ضرور ہے، لیکن اس کی کتابت، طباعت ٹھیک وقت پر اشاعت اور اس کے مالی ذرائع کی کمی کو پورا کرنے کی محنت و ریاضت کا جو نمونہ مولانائے مرحوم کے ذریعہ سے عمل میں آیا وہ علمی اور تعمیری سرگرمیوں کی ایک قابل تقلید مثال ہے،

وہ اب وہاں ہیں جہاں ایک روز سب کو جانا ہے، مگر جن لوگوں کو ان کے ساتھ کام کرنے یا اُن سے ملنے جلنے کا موقع ملا وہ ان کی بشاشت، ملنساری، مرنجاں مرنج انداز طبع، اختلاف کے موقع پر شریفانہ برتاؤ، مسلمانوں کی سیاسی مصیبتوں کے وقت ان کے اندرونی مضطربانہ جذبات اور اُن کے سیاسی مستقبل کو سنوارنے کی خاطر اُن کے فکری رجحانات کو یاد کرکے دل سے دعائیں کریں گے، کہ ان کی زندگی کے روشن کارنامے اُن کے لئے توشۂ آخرت بنیں، اور وہ بارگاہ ایزدی میں کہہ رہے ہوں ربِّ اغفر و ارحم وانت خیر الراحمین

مقالات

مطالعۂ سیرت اور مستشرقین

از

جناب ڈاکٹر نثار احمد، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی

تمہید ہمارے یہاں کے علمی اور دینی حلقوں میں مستشرقین کا نام اور ان کا کام اب خاصا مشہور و متعارف ہوچکا ہے، اور فی زمانہ ایسے بالغ نظر علماء کی کمی نہیں ہے جو مستشرقین کی علمی مساعی، ان کے تحقیقی کارناموں اور ان کے مالہٗ وما علیہ سے واقف نہ ہوں، تاہم اسلامی علوم کے حوالہ سے بالعموم اور مطالعۂ سیرت کے حوالہ سے بالخصوص مستشرقین کے کام کی نوعیت، ان کے رویہ اور سلوک اور ان کی کیفیت و کمیت سے عام طور پر بے خبری پائی جاتی ہے اور وقت کی ضرورت ہے کہ اردو داں طبقہ کے سامنے خاص طور پر پورے مسئلہ کا ایک مفصل علمی جائزہ پیش کردیا جائے۔

تعارف واقعہ یہ ہے کہ مستشرقین کے بارہ میں صورت حال اب پہلے سے بہت مختلف ہوچکی ہے، ایک زمانہ تھا کہ اسلام، پیغمبر اسلام اور اہل اسلام کے لیے مستشرقین کا تعصب و تظلم اپنی انتہا پر تھا، اور ان کی تحریروں میں بے باکی و گستاخی، فحاشی کی حد تک پائی جاتی تھی جس سے بعضوں کو خود شرم آتی، لیکن پھر رفتہ رفتہ بحیثیت مجموعی، مختلف عوامل کے نتیجہ میں شدت کم ہوتی چلی گئی، مختلف مکاتب فکر وجود میں آئے اور انکشافِ حقیقت کے ساتھ ساتھ خود مستشرقین کے گروہ میں کچھ معتدل قسم کے مصنفین بھی شامل ہوگئے، یہاں تک کہ عہد جدید میں استشراق اور مستشرقین، مسلم اور غیر مسلم دونوں کی تنقید کا نشانہ بنے ہوئے ہیں کہ انھوں نے اسلام اور دنیائے اسلام کو بہت غلط طور پر پیش کیا ہے

نتیجۃً یہ ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ جو کچھ نظریات پہلے قائم کئے گئے تھے، ان کو بالکل بدلنا ممکن نہ ہو تو ان پر نظر ثانی بہر حال کی جانی چاہئے، شاید یہی وجہ ہے کہ اب بعض مستشرقین نے اپنے نظریات واقعۃً تبدیل کر لیے ہیں، اور بعض حلقہ بگوشِ اسلام بھی ہو گئے ہیں۔

آغاز کار دنیا کی مختلف زبانوں میں بالعموم اور انگریزی و عربی میں بالخصوص مستشرقین کے بارہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مستشرقین کے علم و تحقیق کی نوعیت و حقیقت اپنے اور پرائے سب پر کھلتی جارہی ہے، بلکہ پچھلے دو ایک عشروں میں تو انگریزی زبان میں بعض کتابوں کی اشاعت نے خود مغربی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا ہے، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی حالات دنیا کے ہر حصہ میں بہت کچھ بدل رہے ہیں، علم و تحقیق کی بہت سی نئی راہیں دریافت ہو چکی ہیں اور بوڑھوں کے مقابلہ میں نوجوان نسل فکر و نظر کی نئی تبدیلیوں کی نقیب بنتی جارہی ہے، انگریزی کے علاوہ عربی زبان میں بھی مستشرقین کے حوالہ سے بعض اہم کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں، مثلاً (۱) العقیقی، نجیب، المستشرقون، دار المعارف، مصر ۱۹۶۴ء (ج ۱ تا ۳) (۲) احمد ابراہیم خلیل، المستشرقون والمبشرون فی العالم الاسلامی، قاہرہ ۱۹۶۳ء (۳) زکریا، ہاشم زکریا، المستشرقون والاسلام، لجنۃ التعریف بالاسلام، مصر ۱۹۶۵ء (۴) الہراوی حسین، المستشرقون والاسلام، المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ ۱۹۶۵ء (۵) البہی، محمد، المستشرقون فی موقفہم من الاسلام، الازہر، طبع جدید (۶) الدسوقی، محمد، الاسلام والمستشرقون، قاہرہ ۱۹۶۲ء (۷) شبلی، عبدالجلیل، الاسلام والمستشرقون، قاہرہ ۱۹۶۸ء (۸) صبرہ، دکتور عفاف، المستشرقون ومشکلات الحضارۃ، دار النہضۃ العربیہ قاہرہ ۱۹۶۸ء، ان میں سے اول الذکر کتاب اہم ترین اور مفصل ترین ہے، جو سرنامہ کے عین مطابق اس موضوع پر واقعی ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، پوری کتاب تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے (تقریباً ۱۲۰۰ صفحات) العقیقی نے بڑی جامعیت کے ساتھ دنیائے مغرب کے تمام اہم علاقوں (فرانس، اٹلی، برطانیہ، اندلس، پرتگال،

ہالینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سوئٹزرلینڈ، سویڈن، روس، امریکہ وغیرہ) کے تمام قابل ذکر مستشرقین (اگرچہ بعض کا ذکر چھوٹ گیا ہے مثلاً فان کریمر وغیرہ) کے احوال و آثار کو جمع کر دیا ہے۔

جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے تو تاریخی اعتبار سے جس طرح سیرت نگاری کے حقیقی دور کا آغاز سر سید احمد خاں م ۱۸۹۸ء اور ان کے رفقاء سے ہوا، اسی طرح مستشرقین کے حوالہ سے بھی مطالعۂ سیرت کا علمی محاذ بھی سب سے پہلے دراصل سر سید احمد خاں نے ہی کھولا، اور اس حقیقت کے باوجود کہ سر سید کے دینی افکار میں تجدد کا رنگ غالب تھا اور راسخ العقیدہ علماء کو ان سے حد درجہ اختلاف تھا اور ہے، سر سید نے جذبۂ ایمانی اور خالص جرأتِ رندانہ سے کام لے کر اپنے ہمعصر مستشرق سر ولیم میور کی دلآزار تصنیف دی لائف آف محمدؐ (حیات محمدؐ) کی اشاعت پر خاموشی کو گناہ کے برابر خیال کیا، اور ذرائع کی کمی کے باوجود، اہانت رسول کا خاموش بدلہ لینے کے لئے اپنا تن من دھن سب لگا دیا اور خالص علمی سطح پر میور کی کتاب پر تنقید و محاکمہ کر کے، مناظرانہ رنگ سے پاک تاریخی حقائق و اسناد پر مبنی، ایک جوابی کتاب "الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ" لکھی اور یوں انیسویں صدی کے اواخر سے گویا مستشرقین کے مقابلہ میں ایک جوابی علمی تحریک کا آغاز ہو گیا، یہ بڑا اہم دور تھا، یہی وہ زمانہ تھا جب مستشرقینِ یورپ فی الواقع سیرتِ رسولؐ کے اصل عربی مآخذ سے علمی طور پر واقف ہوئے، اور پھر ان ہی کی منظم کوششوں سے بہت سے مآخذ زیور طبع سے آراستہ ہو کر مسلمانوں تک پہونچے، اسی دور میں مستشرقین نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام پر اپنے شدید حملے جاری رکھے اور تلاش کر کر کے مجروح اور ناقابل اعتماد روایتوں کو بطور سلاح استعمال کیا، تاکہ مسلمانوں کے دلوں سے سیرتِ رسولؐ کا اعتبار اٹھ جائے اور پھر اس کے نتیجہ میں آپ کا لایا ہوا دین بھی بے اعتبار و بے وقعت ٹھہرے۔

ابتدائی جائزہ سر سید کی مخلصانہ کوششوں سے تحریک استشراق کے بالمقابل جس علمی تحریک کا آغاز ہوا تھا، اسے بعد میں مزید توسیع و ترقی حاصل ہوئی، اس سلسلہ میں اگرچہ مختلف بزرگوں نے قلم اٹھایا،

اور سیرت پر متعدد کتابیں لکھی گئیں، لیکن جو شہرت اور بقائے دوام علامہ شبلی (م ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء) کو حاصل ہوئی، وہ اور
کسی کے حصہ میں نہیں آئی، علامہ شبلی کو یہ تقدم بھی حاصل ہے کہ انھوں نے محض چند مستشرقین کی انفرادی
کوششوں کو ہی نشانۂ تنقید نہیں بنایا بلکہ انھوں نے پورے گروہ مستشرقین کو اپنے سامنے رکھا جو اسلام اور
علوم اسلامی پر بالعموم اور سیرتِ رسول ﷺ پر بالخصوص طبع آزمائی کر رہا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ تحریک استشراق
کے جواب میں علمی و تحقیقی کام کا ایسا نقشہ مرتب کیا کہ اگر ان کی زندگی وفا کرتی اور وہ اس کو عملی جامہ پہنا سکتے
تو سیرۃ النبی، مستشرقین کے اعتراضات و مطاعن کا بھی یادگار جواب بن جاتی، بہرحال مطبوعہ سیرۃ النبی
کے آغاز میں ہی اور باتوں کے علاوہ علامہ شبلی نے "یورپین تصنیفات" کے عنوان سے مستشرقین کی تصنیفات
ان کے اسباب و محرکات، ان کے اصول مشترکہ اور ان کی مساعی کا عہد بہ عہد جائزہ لیا اور پھر مشہور
مستشرقین کی ایک مختصر فہرست بھی شاملِ کتاب کر دی، یہ تمام کام اپنے ابتدائی درجہ میں تنقیح طلب ہونے
کے باوجود نہایت وقیع ہیں۔

علاوہ ازیں، علامہ شبلیؒ چونکہ اپنی کتاب سیرۃ النبی ﷺ کو دراصل ایک دائرۃ المعارف بنانا چاہتے تھے،
اس لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ مستشرقین کے مطالعۂ سیرت کو معیارِ تنقید پر نہ پرکھتے اور نہ زیر بحث لاتے، بلکہ مستشرقین
کی نام نہاد علمی تحقیقات کا پردہ چاک کرنا اور سیرت کے حوالہ سے ان کی غلط بیانیوں پر تنقید و تعقب تو گویا
انتہائے مقصود تھا، اور ان کی زندگی کی آخری خواہش بھی غالباً اسی لئے انھوں نے سیرۃ النبی کے مجوزہ خاکہ
میں پانچواں حصہ خاص یورپین تصنیفات کے متعلق شامل کیا تھا، جو اگرچہ پورا نہ ہو سکا، تاہم آنے والوں
کے لئے روشنی چھوڑ گیا اور یہ ثابت کر گیا کہ خود مولانا شبلیؒ مسئلہ مستشرقین کی گہرائی اور گیرائی کا بہ حد غایت
ادراک رکھتے تھے۔

افسوس کہ علامہ شبلیؒ کے بعد مستشرقین کے حوالہ سے سیرتِ رسول ﷺ کے مطالعہ و تحقیق کا کوئی بڑا
اور منظم کام سامنے نہیں آیا اور نہ ہمارے ہاں کے سیرت نگاروں نے اس مسئلہ سے تعرض کو قرار واقعی

اہمیت دی، البتہ یہ ضرور ہے کہ اکا دکا، انفرادی یا اجتماعی کوششیں کی جاتی رہی ہیں اور اب بھی مقالات
و مضامین اور کتابچوں میں اس جانب کچھ نہ کچھ پیش رفت بہرحال ہو رہی ہے، مثلاً ایک مسلمان مصنف
محمد حسین ہیکل کی کتاب "حیاتِ محمد" کا تذکرہ بے محل نہیں معلوم ہوتا، جو اگرچہ عربی زبان میں ہے
لیکن اردو ترجمہ کے بعد گویا وہ اردو ادب کا ہی سرمایہ بن گئی ہے، ہیکل نے اپنے بیان کے مطابق
نہ صرف یہ کہ "جامدین عن المسلمین" کے جمود آمیز خیالات کا رد کیا، بلکہ مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کا مثبت
انداز سے جواب دینے کے لئے بھی کتاب لکھی، ہیکل نے متن کتاب کے علاوہ اپنے طویل مقدمہ میں اور پھر
بعد میں "المستشرقون والحضارۃ الاسلامیہ" کے تحت مستشرقین کی معاندانہ سرگرمیوں اور ان کے علم و
تحقیق کا سنجیدہ علمی تجزیہ کیا ہے اور مختلف عنوانات (مثلاً اسلام اور مسیحیت کی کشمکش، مسیحی مصنفین کی
نظر میں آنحضرت ﷺ کا مقام، مسلمان مصنفین اور مغربی افترا پرداز مستشرقین وغیرہ) کے تحت اصل حقائق
کو نمایاں کیا ہے اور جرأت و قوت کے ساتھ مسیحی سوانح نگاروں کے اعتراضات کا جواب دینے کی سعی کی۔

نوعیتِ مسئلہ: یہ جائزہ اگرچہ مختصر ہے لیکن یہ واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ مستشرقین کی برپا کی ہوئی
تحریک استشراق کا قرار واقعی جواب اردو زبان و ادب میں اب تک نہیں دیا گیا ہے اور حقیقت
یہ ہے کہ سر سید احمد خاں نے جس جوابی علمی تحریک کا آغاز کیا تھا اور جسے مولانا شبلی نعمانی نے منظم و موثر بنانے
کی کوشش کی تھی، اس کا رنگ آہستہ آہستہ پھیکا اور اس کا آہنگ روز بروز مدھم ہوتا چلا گیا، یہاں تک
کہ اب سرگرمی نہ ہونے کے برابر ہے، اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ادھر مغربی اور یورپی مستشرقین
کی سرگرمیاں تو لب و لہجہ کے فرق کے ساتھ تاحال جاری و ساری ہیں اور ان کے عزائم و مقاصد
میں بھی سر مو فرق نہیں آیا ہے، لیکن ادھر ہماری طرف سے انتظام و اہتمام صفر ہے، مولانا شبلی وغیرہ
نے مستشرقین کی علمی تحقیقات اور ان کے معیار کی جو نشان دہی کی تھی اور ان کی تصانیف کو جس طرح
کذب و افترا کا دفتر قرار دیا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ مستشرقین کی کتابوں کو کھنگالا جاتا اور تمام علوم

اسلامیہ میں بالعموم اور سیرتِ رسولؐ کے باب میں بالخصوص، واقفیتِ تامہ حاصل کرکے، ان کی غلطیوں، بددیانتی اور تلبیس وتحقیق کا پردہ چاک کیا جاتا، اور اس سلسلہ میں بڑے پیمانہ پر ایک منظم کام کا نقشہ بنایا جاتا، مگر ایسا نہیں ہوسکا، بلکہ المیہ یہ ہوا کہ اس مسئلہ کی اہمیت وشدت کو محسوس ہی نہیں کیا گیا، نہ ایسے ادارے وجود میں آئے جو اعلیٰ سطح پر علم وتحقیق کی سرپرستی کرسکیں اور ان کوششوں کو متحد و منظم کرسکیں جو انفرادی واجتماعی اور نجی وسرکاری، مختلف پیمانوں پر کی جاتی ہیں، ہماری ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں اس معیار کی علمی وفنی تیاری نہیں پائی جاتی جو مستشرقین کا طرۂ امتیاز ہے، مستشرقین کے حملوں کا دفاع محض عبارت آرائی یا جوابی الزام تراشی سے نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کے لئے اسی تیاری کی ضرورت ہے، جس قسم کی تیاری خود مستشرقین نے کی تھی (مثلاً علم وتحقیق کے اداروں کا قیام، مختلف زبانوں کی تحصیل، تجسس وتفحص کے آداب، فنی مہارت اور جدید تکنیک سے واقفیت، ادب وثقافت کا گہرا مطالعہ، ضروری علوم وفنون سے دلچسپی، مشنری جذبہ، متعین مقاصد اور انتھک محنت وریاضت وغیرہ)

مستزاد یہ کہ مستشرقین کی تحریک کو ایک گونہ تقویت خود ان مسلمان محققین وعلماء کے رویہ سے مل رہی ہے جو دنیائے مغرب کے مختلف اداروں میں حصول تعلیم وتحقیق کے لئے جاتے ہیں تو وہاں کے احوال ومناظر سے اس درجہ متاثر ومرعوب ہوجاتے ہیں کہ انہی کے ہم آواز ہوجاتے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ جوابی علمی تحریک کو نئے سرے سے منظم کیا جائے اور مرحلۂ اول میں مسئلۂ مستشرقین کی نوعیت وحقیقت کو سمجھ لیا جائے اور یہ جائزہ لے لیا جائے کہ استشراق ومستشرقین کی تحریک، اس کے مقاصد، اسباب ومحرکات عہد بہ عہد ارتقاء اور اعلام ومشاہیر کی عام صورت کیا ہے؟ زیر نظر مقالہ کا مدعا یہی ہے،

استشراق مستشرق استشراق اور صاحبانِ استشراق (مستشرقین) کی پوری تاریخ پر ایک عمومی نظر

ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تحریک استشراق، اپنی حقیقت وماہیت میں چونکہ اسلام کے خلاف ہے اور ہر دور کے (غیر مسلم) مستشرقین کی تمام سرگرمیاں اپنے علمی تنوع کے باوجود، چونکہ اسلام، پیغمبر اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم وفنون کے حوالہ سے بہرحال معاندانہ رہی ہیں اور چونکہ مستشرقین کی پوری جماعت میں شامل افراد اپنی اصل ونسل میں یہودی ہیں یا عیسائی، اس لئے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اسلام اور یہودیت وعیسائیت کے مابین آویزش کے ساتھ ہی استشراقی جذبہ وفکر کی نمو ہوگئی تھی، تاہم اپنے مخصوص فنی واصطلاحی معنوں میں اور اطلاقات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ تحریک استشراق کا باقاعدہ آغاز اور مستشرقین کی علمی وتحقیقی سرگرمیاں بہت بعد میں شروع ہوئی ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ :-

(۱) استشراق اور مستشرق کی اصطلاحیں لغوی اعتبار سے بہت زیادہ قدیم العہد نہیں ہیں، بلکہ انگریزی زبان وادب میں ان کا استعمال اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں اٹھارہویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا، چنانچہ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کی تصریحات کے مطابق مذکورۂ بالا دونوں الفاظ اورینٹ سے مشتق ہیں جس کے معنی ہیں شرق یا مشرقی سمت، جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے، پھر اسی سے اورینٹل ہے یعنی مشرقی، جو تمام معنوں میں مغربی (OCCIDENTAL) کا ضد ہے، مشرقی کے مفہوم میں وہ متوطن بھی ہے جو مشرق یعنی ایشیا یا ان ممالک کا باشندہ ہو جو بحر روم متوسط اور قدیم رومی سلطنت کے مشرق میں واقع ہیں، جبکہ اورینٹلزم یعنی مشرقیت یا استشراق کے معنی ہوں گے، مشرقیت، مشرقی خصوصیات، مشرقی طرز وادا، اقدار، علوم وآداب اور فنون وثقافت وغیرہ سے واقفیت اور مہارت وغیرہ، نیز اس کے تحت اورینٹل اسکالرشپ کا مطلب ہوگا، مشرقی زبانوں سے واقفیت اور پھر اس سے بنا ہے اورینٹلسٹ (مستشرق) اس سے مراد وہ شخص ہوگا جو مشرقی زبانوں، علوم وفنون اور تہذیب وتمدن وغیرہ پر عبور رکھتا ہو یا بقول مولوی عبدالحق ماہر شرقیات ہو،

(ب) عربی، فارسی اور اردو کی قدیم لغات میں استشراق کا اصل مادہ یعنی ش، ر، ق تو موجود ہے، لیکن زیر بحث الفاظ یعنی باب استفعال میں اس کے معنی و مفہوم یا بطور فعل ان لغات سے بحث نہیں پائی جاتی (البتہ جدید لغات میں ان کا ذکر موجود ہے) عربی قواعد کی رو سے استشراق، ثلاثی مزید کا باب استفعال ہے، جس کا مادہ ش، ر، ق (شرق) ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس باب کے جملہ خصائص و لوازم یعنی اتخاذ و طلب، وجدان و حسبان اور تمول و تکلف وغیرہ کی جلوہ نمائی، صاحبانِ استشراق کے احوال و شخصیات سے اور ان کی تحقیقات و تخلیقات میں بہت نمایاں نظر آتی ہے، گویا الفاظ کا پیکر، بجائے خود اس بات کا مظہر ہے کہ مستشرقین کا تمام تر علم اکتسابی ہے، جسے انھوں نے بڑی محنت و ریاضت سے طلب و جستجو کر کے حاصل کیا، اس کی خاطر سفر و حضر، تمکن و توطن اختیار کیا اور پھر اپنی تحقیقات کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ ان میں تخمین و ظن اور تخیل سے زیادہ کام لیا گیا ہے"

مختصر یہ کہ عربی میں استشراق کے لغوی معنی ہوں گے بہ تکلف مشرقی بننا اور مستشرق کا مطلب ہوگا وہ شخص جس نے بہ تکلف مشرقیت اختیار کی یا مشرقی بنا ہو۔ اردو لغت و ادب میں بھی کم و بیش یہی مفہوم ہے یعنی مستشرق کا مطلب ہوگا "وہ فرنگی جو مشرقی زبانوں اور علوم کا ماہر ہو یا وہ فرنگی یا امریکی جو مشرقی زبان یا علوم کا ماہر ہو،

زبان و لغت کی مندرجہ بالا بحث سے استشراق اور مستشرق کا مفہوم اگرچہ کسی قدر واضح ہو جاتا ہے اور مستشرق کی نوعیت و ماہیت بھی بڑی حد تک سمجھی جا سکتی ہے تاہم استشراق کی اصل حقیقت اس وقت سامنے آئی جبکہ استشراق، السنۂ مشرقیہ کی واقفیت اور اسلامی علوم و آداب کے یک رخی مطالعہ تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ آگے بڑھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام سے بغض و عناد، اس کا جزو لازم ٹھہرا، پھر یہی بغض و عناد، پہلے پہل تو شدید جذباتیت کا آئینہ دار رہا، لیکن کچھ عرصہ بعد اس نے متعین مقاصد کے تحت علمیت کا لبادہ اوڑھ لیا، گویا اس دوسرے مرحلہ میں استشراق نے ایک تحریک ایک

مستقل رویہ اور سلوک کی شکل اختیار کر لی اور اسی رویہ و سلوک کے احاطہ میں رہتے ہوئے تمام ضروری مباحث کو موضوع سخن بنایا گیا، مثلاً اسلام اور اس کی تعلیمات کو مجبوراً یا تکلفاً غلط طور پر پیش کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ زمانہ کے عہد بہ عہد ارتقاء کے ساتھ وہ تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتیں، قدیم تہذیبوں، قدیم زبانوں کو پھر سے زندہ کرنے کے لئے مصر، عراق، شمالی افریقہ اور دوسرے علاقوں میں سرگرمیوں کو منظم کیا گیا تاکہ یہ تہذیبیں، اسلامی تہذیب و تمدن کے لئے چیلنج بن سکیں، عربی زبان کے لئے کہا گیا کہ قرآنی عربی، عہد جدید کی ضروریات و حالات سے مطابقت پیدا نہیں کر سکتی، اس لئے مقامی زبانیں اور مردہ لغات کو آگے بڑھانا چاہئے بلکہ عربی رسم الخط کو رومی رسم الخط سے تبدیل کر دینا چاہئے، پیغمبر اسلام کی سیرت و کردار کے بارہ میں ان نکات کو اچھالا گیا، جن سے عام ذہن کے لوگ بھی اچھا تاثر نہ لے سکیں اور ان کے لائے ہوئے مشن کو ناقابل التفات گردانا جائے، اسلامی تہذیب و ثقافت کی تعمیر و ترکیب میں بیرونی عناصر کی کارفرمائی ثابت کی جائے تاکہ اسلامی ثقافت مجموعۂ خرافات ٹھہرے وغیرہ وغیرہ، ان تمام مطالعات کا ہدف بہرحال مستشرقین کے نزدیک اپنے عزائم کی تکمیل کے سوا کچھ نہ تھا، ہاں یہ ضرور ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ حکمتِ عملی تبدیل ہوتی رہی اور وقت گزرنے کے ساتھ مستشرقین جذباتیت کے تنگ دائرہ سے نکل کر عقلیت، علمیت اور استدلال کے اوزان و پیمانے استعمال کرنے لگے، اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق اپنے رویہ پر خود انھوں نے نظر ثانی کی اور بدنیتی کے باوجود مخالفت و مخا کا اظہار رفتہ رفتہ سلیقہ سے کیا جانے لگا اور اسلام کے مقابلہ میں تعصب و تظلم کا پھیلاؤ بھی نسبتاً کم ہوتا گیا،

مختصر یہ کہ مستشرقین کا رویہ ہر زمانہ میں یکساں نہیں رہا اسی لئے ان کے ہاں علم، تجربہ، انداز استدلال مذہبی حیثیت اور وابستگی کے مختلف نمونے نظر آتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان کے فکر و فن اور تحقیق و تالیف کا معیار بھی جدا جدا ہے،

لیکن یہ اجمالی گفتگو کسی ذہنی اشکال کا سبب ہو، اس لئے اس اجمال کی کچھ تفصیل، آئندہ صفحات میں عرض کی جائے گی، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ استشراق جذبہ و فکر سے آگے بڑھ کر تحریک کیسے بنا اور مطالعہ و تحقیق کے مختلف دائروں میں مستشرقین کا رویہ و سلوک کیا رہا۔

تحریک استشراق کا آغاز تحریک استشراق کو اگر خلافِ اسلام سرگرمیوں کی علامت مانا جائے تو یہ امر واقعہ ہے کہ اس قسم کی سرگرمیوں کا آغاز دراصل ظہور اسلام کے ساتھ ہی ہو گیا تھا اور باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کرنے سے پہلے بھی، اہل مغرب کی طرف سے اسلام کے خلاف بالعموم اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف بالخصوص، بغض و عداوت کا اظہار موقع بہ موقع، تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوتا رہا، اور دو جذبات سے سرشار رومی، بازنطینی، لاطینی، مسیحی اور یہودی روایتیں صدیوں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں، افواہوں کے دوش پر سفر کرتی رہیں اور کبھی کبھار تحریر و تصنیف اور وقائع و اشعار کے قالب میں ڈھلتی رہیں اور ان کی اپنی آئندہ نسلوں کا سرمایۂ افتخار قرار پائیں، چنانچہ ظہور اسلام کے بعد سے کوئی چار ساڑھے چار سو سال تک اسلام اور بانیٔ اسلام ﷺ کے حوالہ سے ان کی مخالفت و مخاصمت کا عام انداز یہی رہا، اور اس تمام عرصہ میں، بلکہ اس کے بعد بھی مغربی دنیا اس قابل نہ ہو سکی کہ حقائق و واقعات کا صحیح ادراک کر سکے اور مسلمانوں کی تاریخ و ثقافت کو علم کی روشنی میں جان سکے، اس صورت حال کا ایک بظاہر سبب، ان کے دلی جذبات کے علاوہ، یہ تھا کہ صحیح معلومات کے لئے اصل اسلامی مآخذ تک رسائی ممکن نہ تھی، پھر تعصب، سنی سنائی باتوں، غلط فہمیوں اور خود ساختہ مفروضات نے انھیں اس قابل ہی نہ رکھا کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی حقیقی تصویر دیکھ سکیں، اس پر مستزاد تصادم و کشمکش کے وہ واقعات تھے جو تاریخ میں بار بار دہرائے گئے، خاص طور پر آنے والے زمانہ میں صلیبی محاربات کا سلسلۂ دشمنی و عداوت کا ایسا نشان پر طاری ہوا جو آج تک نہیں اترا، صلیبی جنگوں کے طویل محاربات میں دنیائے مغرب کی ناکامی سے نہ صرف یہ کہ یورپ کی مشترکہ عسکری قوت پاش پاش ہو گئی بلکہ یہی شکست اس بات کا زبردست محرک بن گئی کہ جنگی محاذ پر پسپا ہونے کے بعد ذہنی و فکری

محاذ پر اسلام اور دنیائے اسلام کو زک پہنچائی جائے، اس کی تدبیر اس سے بہتر کوئی اور نہ تھی کہ اسلام، اسلامی عقائد، پیغمبر اسلام ﷺ اور اسلامی معاشرہ کو ہدف تنقید بنایا جائے، چنانچہ اس کام کے لئے جذباتی طوفان پہلے سے موجود تھا، پھر لاطینی آباد کار اور مسلم علاقوں سے آئے ہوئے عیسائی اور یہودی، اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کچھ علم و معلومات رکھتے تھے وہ کتنی ہی ناکارہ و خام سہی، ان کے لئے بہرحال مفید مطلب تھیں جن کی مدد سے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی (خاکم بدہن) ایک نفرت انگیز کریہہ المنظر اور بھیانک تصویر پیش کی جا سکتی تھی، اور سیرت ختم الرسل ﷺ کو افراط و تفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیالی اور قیاسی انداز سے پیش کیا جا سکتا تھا، مختصر یہ کہ اس پورے عرصہ میں بحیثیت مجموعی، پیغمبر اسلام ﷺ کے بارہ میں مغرب کے پاس معلومات انتہائی مبہم اور ناقص تھیں اور اس خلا کو افسانہ طرازی اور دیومالائی کہانیوں سے پر کیا گیا، اس افسانوی مواد کے بھی دو حصے تھے، ایک حصہ تو وہ تھا جس کے تحت آنحضرت ﷺ کے واقعاتِ سیرت کو پیکرِ خیال میں پیش کیا گیا، اور دوسرا حصہ وہ تھا جس کی اپنی اصل اور حقیقت نہ تھی بلکہ وہ مغربی ذہن کی ایجاد و اختراع اور کذب و افترا سے عبارت تھا۔ اس عہد میں آنحضرت ﷺ کے لئے حد درجہ اہانت آمیز الفاظ استعمال کئے گئے، مثلاً (نقل کفر، کفر نہ باشد) آپ ﷺ کو نبی کاذب، مخالف مسیح، موجد مذہب نو، اور بہروپیا کہا گیا اور بد اعتقاد اس حد تک گر گئے کہ آپ ﷺ کے لئے لفظ محمد ﷺ استعمال کرنے کے بجائے (MAHOMD) سے تعبیر کیا گیا جس کے معنی ہیں "شہزادۂ ظلمات" پھر جب صلیبی جنگوں کی ناکامی نے ان کی آتش عداوت اور بھڑکا دی تو وہ حضور ﷺ کے لئے MAPHOMET، BAPHOMET اور BAFUM کے الفاظ استعمال کرنے لگے اور آپ ﷺ کی سیرت و سوانح کے بارہ میں مہمل کہانیاں، دیومالائی قصے اور بے سروپا باتیں مشہور کی گئیں ایک خیال یہ پھیلایا گیا کہ مسلمان دراصل کچھ زیادہ ہی بت پرست تھے اور ان کا مرکزِ پرستش محمد ﷺ کا بت تھا، پھر ایک سے زائد تین بتوں کی پرستش کا فسانہ تراشا گیا اور یہ انکشاف کیا گیا کہ آنحضرت ﷺ تو دراصل خود پیرو دین عیسوی تھے، لیکن پوپ منتخب نہ ہو سکے تو انتقاماً رومی چرچ سے بغاوت کر کے اسلام

ایجاد کیا" وحی و تنزیل کے حوالہ سے یہ افسانہ تراشا گیا کہ محمدؐ نے ایک سفید کبوتر، فاختہ یا قمری کو سدھا رکھا تھا جو ان کے کندھے پر بیٹھا، ان کے کان سے دانہ چگا کرتا تھا جس سے ان کے خیال میں یہ آتا تھا کہ فرشتہ ان سے باتیں کرتا ہے اور دوسروں کو یہ تاثر دیتے تھے کہ ان پر وحی نازل ہو رہی ہے۔

ان مثالوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مغربی علماء، مستشرقین، صدیوں کیسی شدید ناواقفیت کا شکار رہے، کیسی خرافات روایات کو ان کے بڑے بڑے علماء سیرت و سوانح کے نام پر پھیلاتے رہے اور اسلام اور پیغمبر اسلام کی کیسی نفرت انگیز تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے۔

اس قسم کی تصویر کشی میں جن لوگوں نے حصہ لیا، ان کے نام تو بہت ہیں لیکن یہاں تفصیل کا موقع نہیں، البتہ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر جان آف دمشق ہے، جان کو بازنطینی روایات کا بانی سمجھا جاتا ہے اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کے خلاف نفرت اور دشمنی کی آگ پہلے اسی نے بھڑکائی، جان اور اس کے پیروؤں نے (نعوذ باللہ) آنحضرتؐ کو بے دین اور جھوٹا نبی قرار دیا، اس کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ اسلام میں محمدؐ کی پوجا کی جاتی تھی، نیز جان ہی وہ پہلا مشنری تھا، جس نے حضورؐ کی ذات اقدس پر جنسی و شہوانی الزامات کی بھرمار کر دی، اس نے حضورؐ کو نبی کی حیثیت دینے کے بجائے بنیادی طور پر ملحد، بدعتی، اور گمراہ قرار دیا (نعوذ باللہ) اور اسلام کا تعارف ایک نبی کاذب کے بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے کرایا اور یہ نکتہ پیش کیا کہ آنحضرتؐ کے پاس اللہ کا فرستادہ ہونے کی کوئی سند نہیں تھی، جان کے بعد آنے والے قرونِ وسطیٰ کے تمام مصنفین نے بھی جان کا تتبع کرتے ہوئے تصویرِ رسول کو خوب بگاڑا، گھسے پٹے الزامات و اتہامات عائد کئے اور چبائے ہوئے نوالوں کو پھر سے چبایا، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کے ماخذ کم و بیش یکساں تھے اسی لئے جب بھی انھوں نے سیرت پر قلم اٹھایا تو نظم ہو یا نثر، دونوں میں سیرتِ ختم الرسلؐ کو افراط و تفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیال و قیاس کے سہارے پیش کیا، اس تفصیل کا مدعا یہ ہے کہ ظہورِ اسلام کے بعد کئی صدیوں تک بھی مسیحی نفرت و عداوت کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی اور اہل مغرب آنحضرتؐ کو بدستور جھوٹا، بہروپیا، دھوکہ باز، مکار

اور شیطان کا چیلا قرار دیتے رہے کہ اتنے میں صلیبی جنگوں کا طویل سلسلہ جلتی آگ پر تیل کا کام کیا، صلیبی جنگوں میں صلیب سرنگوں ہو گئی اور تمام تیاریوں کے باوجود دنیائے اسلام کو زک پہنچانے کا منصوبہ ناکام ہوا اور انھوں نے دیکھ لیا کہ میدان جنگ میں رسد، کمک اور سامان جنگ کی فراوانی کے باوجود وہ مسلمانوں کا زیادہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو پھر انھوں نے کمال عیاری سے اسباب و وسائل اور تدبیر و حکمت عملی کو یکسر بدل ڈالا اور گویا یہ فیصلہ کر لیا کہ جنگ جیتنے کے لئے نیا ترکش، نئے تیر استعمال کئے جائیں اور گرم جنگ نہ سہی سرد جنگ میں مسلمانوں کو زیر کیا جائے، اور یہ سرد جنگ مادی ہتھیاروں سے نہیں علم و تحقیق کے معنوی اسلحہ سے لڑی جائے، شاید اسی لئے ریمانڈ للی (RAYMONDLULL) نے اہل مغرب کو سب سے پہلے مشرقی علوم کی تحصیل پر آمادہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ایک پُرامن صلیبی جنگ جاری کی جائے جس کے اسلحہ خالص روحانی ہوں"

اس سلسلہ میں اہل مغرب کو دو قسم کی سہولتیں حاصل تھیں، ایک طرف تو یہ کہ ان کے اسلاف نے مشرق و مغرب دونوں جگہ ذہنی پس منظر تو پہلے سے تیار کر رکھا تھا اور گذشتہ کئی صدیوں میں اسلام، پیغمبر اسلام اور دنیائے اسلام کے بارہ میں مہمل خیالات، بے سروپا قصے کہانیوں، بیہودہ الزامات و اتہامات اور تشکیک و تذبذب کے بیج بو کر، خرافات کا ایسا جنگل اگا دیا تھا جسے کاٹنا آسان نہ تھا، برسہا برس کے پروپیگنڈہ نے مغربی ذہن کو اسلام دشمنی کے معاملہ میں ویسے ہی راسخ کر دیا تھا، دوسری طرف انھیں یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ اس زمانہ میں مسلمان علم و فن کے دائروں میں جو ترقیاں کر رہے تھے، اس کے سبب یونانی علوم و فنون کی سینکڑوں کتابیں ترجمہ کے ذریعہ عربی میں منتقل ہو چکی تھیں، اور یوں ان کے آباء و اجداد کا وہ علمی ورثہ جس سے وہ خود بھی زیادہ واقف نہ تھے، عربی میں محفوظ ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں علوم و فنون اور آداب و معارف کے اسلامی مراکز سے اخذ و استفادہ کے لئے اور اندلس و صقلیہ میں مسلمانوں کی روشن کی ہوئی شمعِ عرفان و حقیقت کی روشنی سے اپنے آپ کو منور کرنے کے لئے بھی عربی زبان میں مہارت اور اسلامی علوم و فنون سے واقفیت بالکل ناگزیر تھی، چنانچہ سولہویں صدی

عیسوی میں بالآخر وہ مرحلہ آگیا جبکہ ایک طرف تو عیسائیوں کے مختلف فرقوں کا اتحاد ہوا، سب نے مل کر اسلام کو اپنا واحد مشترکہ دشمن قرار دیا اور ایک متحدہ رومی کیتھولک چرچ کی بنیاد رکھی گئی اور دوسری طرف یہ طے کیا گیا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جس محاذ پر پہلے صرف عیسائی، یہودی، راہب، پادری، قصہ گو، مناظر، شاعر وغیرہ ڈٹے ہوئے تھے، اب ان کی جگہ مغربی دنیا کے وہ عقلا و فضلا لیں گے جو کلاہ علم سے آراستہ ہوں گے اور درس و تدریس کی مسندوں پر فائز ہو کر داد تحقیق دیں گے تاکہ ادھر ان کے ان دیکھے جذبات نفرت و عداوت بھی تسکین پائیں اور ادھر علم و تحقیق کے حوالہ سے ان کا رعب و دبدبہ قائم ہو جائے، چنانچہ یہی ضرورت میں گیام پوسٹل کو (G. POSTEL) گو سامنے لائیں جو عام طور پر مستشرقین یورپ کا باوا آدم شمار ہوتا ہے، وہ پہلا اصولی مستشرق تھا جس نے تحریک استشراق کو منظم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا اور بطور خاص لغت و لسانیات کے حوالہ سے اہم خدمات انجام دیں، پوسٹل ہی کے لئے ۱۵۳۹ء میں کلیۂ فرانس قائم کیا گیا اور وہ عربی کی پہلی کرسی صدارت پر فائز ہوا، گیام پوسٹل کے کام کو لغت و لسانیات کے ہی کے حوالہ سے اس کے لائق و فائق شاگرد جوزف اسکالیجر نے آگے بڑھایا۔ بہر حال کم و بیش پینتالیس سال کی تیاری کے بعد ۱۵۸۶ء میں عربی مطبوعات کا سلسلہ یورپ میں شروع ہوا جس کا سہرا اٹلی حدتک ڈیوک آف تسکانی (TUSCANY) کے سر ہے۔

اوپر کی تفصیل سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں یعنی :۔

(ا) یہ کہ سولہویں صدی عیسوی کو ہم باقاعدہ طور پر تحریک استشراق کا نقطہ آغاز قرار دے سکتے ہیں، یہی وہ دور ہے جبکہ مستشرقین یورپ نے کام کا مربوط و منظم نقشہ مرتب کیا۔

(ب) اس تحریک کی شروعات خالص مسیحی مشنری اور عیسائی پس منظر میں ہوئی جس کا اثر تاریخ مابعد پر جاری و ساری رہا، کیونکہ مستشرقین کا خانوادۂ چرچ (کلیسا) کا پروردہ تھا۔

تحریک کا ارتقاء تحریک استشراق کے حوالہ سے سترہویں اور اٹھارہویں صدی کو خاص اہمیت حاصل ہے، کیونکہ یہ زمانہ تحریک کے ارتقاء، اس کے پھلنے پھولنے کا عہد ثابت ہوا، جہاں تک سترہویں صدی عیسوی کا تعلق ہے، بقول مولانا شبلی "یہ صدی یورپ کے عصر جدید کا مطلع ہے، اور یورپ کی جدو جہد سعی و کوشش اور حریت و آزادی کا دور اسی عہد سے شروع ہوتا ہے، پھر یہ عروج استعمار کی صدی ہے، جس کے پنجۂ استبداد میں رفتہ رفتہ عالم اسلام آتا چلا گیا، یورپی شہزادوں کی سرپرستی میں اسلامی مطبوعات کے بارہ میں معلومات جمع کی جانے لگیں، عربی زبان کی ماہیت و خاصیت کو سمجھنے کی کوششیں ہونے لگیں، یہاں تک کہ ارپی نیس (ERPENIUS, 1584-1626) نے پہلی عربی کی قواعد شائع کی، جو لغوی اصولوں پر مرتب کی گئی تھی، پھر اس کے اتباع میں اس کے شاگرد جیکب جولیس (JACOB GOLIUS, 1595-1667) نے بھی قابل قدر خدمات انجام دیں، اور پھر ۱۶۳۶ء میں ایڈورڈ پوکاک (E. POCOCKE, 1604-1691) پہلا انگریز مستشرق تھا، جسے آکسفورڈ میں شعبہ عربی کا صدر نشین بنایا گیا، مزید برآں عربی زبان کی قواعد اور لغت کی ترتیب کا کام آسٹریا کے میرنسکی (F. MEURNSKI ، ت) نے بھی ۱۶۸۰ء میں انجام دیا، اس کے علاوہ اسلامی علوم اور تہذیب و تمدن کے بارہ میں معلومات حاصل کرنے کے لئے ایک ادارہ ڈی ہربلوٹ (D'HERBELOT) کی سرکردگی میں قائم کیا گیا، اس ادارہ نے ایک اہم کام یہ کیا کہ اس وقت تک جس قدر بھی مشرقی علوم پر کتابیں شائع ہوئی تھیں ان کی ایک باقاعدہ فہرست مرتب کر کے شائع کر دی جو پر از معلومات تھی، اسی ادارہ کے تحت آنحضرتؐ پر ایک کتابچہ بھی شائع کیا گیا،

سترہویں صدی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بقول مولانا شبلیؒ "نئے عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخ اسلام و سیرت پیغمبرؐ کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی، گو موقع

بہ موقع، معلومات سابقہ کے مصالے سے بھی احتراز نہیں کیا گیا، اس صدی میں مستشرقین کے رویہ اور سلوک میں اس تبدیلی اور فرق کی اصل وجہ گویا ان کے ماخذ کے بدل جانے میں مضمر تھی، ازمنۂ وسطیٰ کے روایتی لاطینی اور بازنطینی مواد کی سیاہیوں میں اسلامی اور عربی مصادر نے روشنی پیدا کی اور انھوں نے اس تضاد کو بھی سمجھ لیا جو سیاحوں کے سفرناموں کے اندراجات، ان کے تصورات اور اصل حقائق کے مابین پایا جاتا تھا، اس عہد میں بھی حسب سابق مطبوعات اور تصنیفات بہت کم ہیں، البتہ جو مستشرقین، مطالعۂ سیرت رسول صلعم کے حوالے سے سامنے آئے، ان میں مندرجۂ ذیل قابل ذکر ہیں،

(۱) ولیم بیڈول (W. BEDWELL.) انگریز مستشرق تھا جس کا زمانہ ۱۵۶۱ء تا ۱۶۳۲ء ہے، اس کے آثار و باقیات میں دو کتابیں قابل ذکر ہیں، ایک عربی لغت جو سات جلدوں میں ہے اور ۱۶۱۰ء سے پہلے شائع ہوئی، اور دوسرے سیرت رسولؐ پر کتاب جو لندن سے ۱۶۱۵ء میں شائع ہوئی، سیرت کی کتاب نہایت گستاخانہ ہے اور نہایت بے باکی سے کام لیتے ہوئے اس کا نام ہی "محمد کاذب" رکھا گیا ہے (نعوذ باللہ) (۲) واٹیر (VATTIER. P) فرانسیسی مستشرق تھا، اس کا زمانہ ۱۶۱۳ء تا ۱۶۶۷ء ہے، اس نے عربی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد بڑی کثرت سے فرانسیسی میں ترجمہ کیا، (۳) ہاٹنجر (HOTTINGER. J. H) سوئٹزرلینڈ کا ایک مستشرق (۱۶۲۰ء تا ۱۶۶۷ء) اس کے باقیات میں مشرقی تصانیف کی ایک فہرست (مطبوعہ ہائیڈلبرگ ۱۶۵۸ء) قابل ذکر ہے، (۴) ڈاکٹر ہنری اسٹب (DR. HENRY STUBBE) سترہویں صدی کا مشہور مستشرق بہ زمانہ (۱۶۳۱ء تا ۱۶۷۶ء) اس کی مشہور کتاب (جو پہلے پہل لندن سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی) کا نام ہے (AN ACCOUNT OF THE RISE AND PROGRESS OF MOHAMETANISM) کہا جاتا ہے کہ اگر اس کی کتاب کی کچھ تاریخی غلطیاں نظر انداز کر دی جائیں تو اسے سیرت رسولؐ کی ایک معقول و معتدل تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے

اور جیسا کہ اس کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے، یہ کتاب گویا مغرب کی جانب سے سیرت رسولؐ کے بارہ میں اولین اعتذار ہے، اس کتاب میں اسٹب نے نہ صرف یہ کہ اس رویہ کا جائزہ لیا ہے جو پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ مسیحی مصنفین نے پہلے اختیار کر رکھا تھا، جبکہ ان مصنفین کی تصویر کو اس نے مکروہ قرار دیا ہے جو انھوں نے اخلاق و کردار نبوی صلعم کی کھینچی تھی، اور انتہائی عالمانہ شان سے یہ اقرار کیا ہے کہ "اس آسمان کے نیچے سوائے محمد صلعم کے کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو تمام دنیائے انسانیت کی مرکز توجہ بنی ہو کہ اپنے تو اس پر عقیدت کے پھول نچھاور کریں اور غیر اسے نگاہ آتشیں سے دیکھیں، مشرق میں اسے سراہا گیا، لیکن مغرب نے التفات نہ کیا۔ (ص ۲۱۱)

دوسرے مستشرقین میں سے جین برَرڈ (GENE BRARD) کا زمانہ گرچہ ۱۵۳۵ء تا ۱۵۹۷ء تھا، لیکن اس کا موقف تقریباً سترہویں صدی میں عام ہوا، وہ ایک مشہور کیتھولک مناظرہ باز تھا، جین بررڈ کو سب سے بڑا اعتراض اس پر تھا کہ حضورؐ نے قرآن کو عربی زبان میں کیوں لکھا؟ وہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ قرآن کو عبرانی، یونانی اور لاطینی جیسی خالص مہذب زبانوں میں کیوں نہیں لکھا گیا؟ پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ اس لئے کہ "محمد صلعم (خاکم بدہن) خود ایک حیوان (جانور، چوپایہ) تھے اور صرف ایک ہی حیوانی (وحشیانہ) زبان (عربی) جانتے تھے، جو ان کے مخصوص وحشیانہ ماحول سے عین مطابقت رکھتی تھی، اس لئے اس کے نقطۂ نظر کے مطابق، قرآن، عربی جیسی وحشی زبان میں لکھا گیا (حادی ص ۴۷-۴۴)

۱۶۵۳ء میں الیکزنڈر روس نے (ALEXANDER ROSS) نے اپنی کتاب (PONDEBLI) شائع کی، وہ اگرچہ تقابل ادیان کے حوالہ سے سامنے آئی، لیکن اس کے ایک حصہ میں، اسلام اور پیغمبر اسلام صلعم کے بارہ میں کچھ بہتر مواد پایا جاتا ہے حالانکہ اس کی پہلی کتاب "حیات محمد" کا مختصر تذکرہ قرون وسطیٰ کے روایتی خرافاتی مواد، قصے کہانیوں اور زہریلے معاندانہ مواد پر مشتمل تھی، لینسلوٹ ایڈیسن (LANCELOT ADDISON) نے ۱۶۷۸ء میں سیرت پر ایک کتاب شائع کی

اگلے سال ہی کتاب نئے عنوان (حیات و ممات محمدؐ) کے نام سے سامنے آئی، مگر اس کے مصادر حسب معمول لاطینی خرافات تھے، آنحضرتؐ کے خلاف اسے سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اپنی کتاب "قرآن" کو اپنی زندگی میں شائع نہیں کیا تھا، ایک اور مستشرق ہمفرے پرائی ڈیکس (PRIDEAUX HUMPHREY) نے حضورؐ کی سوانح لکھی، لیکن اپنے دامن کو وہ بھی خرافات سے نہ بچا سکا، اور دوسروں کی طرح آپ کو خدانخواستہ مدعی کاذب، مکار، فریبی قرار دیا، اس پر تماشہ یہ ہے کہ اس کی کتاب ایک صدی تک دوسروں کے لئے "معیاری کتب حوالہ" بنی رہی، ایک ہی سال (۱۶۹۷) میں دو اشاعتیں عمل میں آئیں اور فرانسیسی ترجمہ بھی ۱۶۹۸ء میں ہوگیا، اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مستشرقین کے حلقوں میں عام مذاق کیا تھا اور کس قسم کے مواد کو ان کے بڑے بڑے علماء استعمال کرتے تھے۔

اٹھارہویں صدی کے دوران بھی تحریک استشراق، منازل ارتقاء طے کرتی رہی، البتہ سفر جیسے جیسے آگے بڑھتا رہا، رخت سفر کم و بیش ہوتا رہا اور اپنے تمام تر مذہبی، مشنری، سیاسی اور استعماری عزائم کے علی الرغم، مستشرقین کے رویہ میں کچھ لچک اور نرمی بھی پیدا ہوگئی، اس نرمی اور لچک کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان میں سے چند کا رویہ، رنگ و آہنگ اور آواز و انداز بدلا اور نسبتاً انصاف پسندی سے کام لیا، بلکہ دل و نگاہ میں گنجائش پیدا کر کے اثبات و معروضیت سے آگے بڑھ کر توصیف و مدح اسلام و پیغمبر اسلامؐ میں بھی بخل سے کام نہیں لیا، ورنہ پرانے خیالات اور ان کے متقدمین کے قائم کئے ہوئے نظریات بہرحال گرم سفر رہے اور مقبولیت بھی انہی کو حاصل رہی، تاہم اتنا ضرور ہوا کہ متشددانہ و متعصبانہ رویہ کے شانہ بشانہ معقولیت و انصاف پسندی کا رجحان بھی جاری و ساری ہوگیا، اور اس رجحانِ نو کا ساز غالباً اس صدی میں سب سے پہلے ولندیزی مستشرق ریلانڈ (H. RELANT) نے ۱۷۰۵ء میں (DE RELIGIONE MOHAMA DICA) لکھ کر چھیڑا، اور اپنے ہم مشربوں سے مطالبہ کیا کہ "ہم مشرق کو اس کے اپنے اصل مآخذ کے ذریعہ ہی سمجھ سکتے ہیں" اور برملا

کہا کہ "تاریخی انصاف" کے ترازو میں تو ہمیں اسلام کو بھی تولنا چاہئے، پھر اس "نے نوازی" میں پیری بائل اور بولین، ویلرز وغیرہ بھی شامل ہوگئے،

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں مغرب نے اسلام، پیغمبر اسلامؐ اور مسلمانوں کی طرف بنظر شفقت دیکھا اور افہام و تفہیم کی جانب پیش قدمی کی،

اس صدی میں مستشرقین کی ذاتی و انفرادی کوششوں کے علاوہ سرکاری اور اجتماعی سطح پر بھی سرگرمیاں منظم کی گئیں، خصوصاً اس صدی کے اواخر میں ان رجحانات نے زیادہ زور پکڑا، بقول مولانا شبلی "یہ وہ زمانہ ہے، جب یورپ کی قوت سیاسی، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوگئی، جس نے اورینٹلسٹ کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کردی، جنہوں نے حکومت کے اشارہ سے السنۂ مشرقیہ کے مدارس کھولے مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے سامان پیدا کئے، اورینٹل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا" اور آخر کار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درسگاہیں اور انجمنیں جاری ہوگئیں، عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا" السنۂ مشرقیہ کے علاوہ مسلمانوں کے سائنسی علوم پر علمی و تحقیقی کام کی غرض سے پیرس میں ۱۷۹۵ء میں ایک ادارہ قائم کیا گیا، اس کے تحت اضافی طور پر مشرقی زبانوں کے بارہ میں بھی معلومات اکٹھا کی گئیں،

اٹھارہویں صدی کی ایک خصوصیت اس تحریک کے حوالہ سے یہ بھی ہے کہ استشراق اور مستشرق کی اصطلاحوں کا رواج اسی زمانہ میں شروع ہوا، چنانچہ انگلستان میں ۱۷۷۹ء کے لگ بھگ اور فرانس میں ۱۷۹۹ء کے قریب مستشرق کی اصطلاح رائج ہوئی اور پھر جلد ہی استشراق نے بھی رواج پالیا، اور اس کے ساتھ ایک مخصوص تصور اور مخصوص سلوک اور رویہ نے بھی جنم لیا، اس صدی کے مشاہیر علمائے مستشرقین میں سے چند قابل ذکر یہ ہیں (۱) سائمن اوکلے (OCKLEY:S) انگریز

مستشرق، جس کا زمانہ ۱۶۷۸ء تا ۱۷۲۰ء تھا، اس کی کتاب مسلمانوں کی تاریخ پر ۱۷۰۸ء تا ۱۷۱۸ء شائع ہوئی، یہ تین جلدوں میں تھی، کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مستشرقین کے نتائج تحقیق کو عام لوگوں کی رسائی کے قابل بنایا گیا (۲) ایڈورڈ پوکاک، انگریز مستشرق، جس کا زمانہ ۱۶۲۵ء تا ۱۷۲۶ء تھا، اس کا ہم نام ایک مستشرق سترہویں صدی میں گزر چکا ہے (۳) جارج سیل، انگریز مستشرق جس کا زمانہ ۱۶۹۷ء تا ۱۷۳۶ء تھا، اس نے ۱۷۳۴ء میں قرآن کا ترجمہ شائع کیا اور بعض مستشرقین کے کلماتِ خیر کے ردعمل میں آنحضرت صلعم کو نبی کاذب اور اسلام کو فاسد مذہب قرار دیا (۴) جین گیجنیر (GAGNIER. J) انگریز مستشرق، جس کا زمانہ ۱۶۷۰ء تا ۱۷۴۰ء تک کا تھا اس نے دو کتابیں شائع کیں، ان دونوں کتابوں کا مقصد بولین ویر کی تالیف کی تاثیر کو کم کرنا تھا. بلکہ بولین ویر کے مقابلہ میں اس نے ایک نئی تالیف پیش کی جو ۱۷۲۳ء میں امسٹرڈم سے نمودار ہوئی (۵) رسک (REISKE, J.J) جرمن مستشرق، جس کا زمانہ ۱۷۱۶ء سے ۱۷۷۴ء تک تھا، وہ جرمنی کا کلاسیکی لغوی اور عربی اسکالر تھا، اور یونانی زبان و ادب پر سند مانا جاتا تھا (۶) ایڈورڈ گبن، انگریز مورخ، زمانہ (۱۷۳۷ء تا ۱۷۹۴ء) اپنی کتاب تاریخ زوال روما کے لئے خاصی شہرت کا حامل، اس نے ۱۷۵۰ء میں کتاب مذکور کے پچاسویں باب میں اسلام اور آنحضرت صلعم کے بارہ میں نہایت دل آزار رائے کا اظہار کیا اور رواداری کے دعوی کے باوجود، آنحضرت صلعم کو نبی کاذب کا خطاب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم آخری ایام میں شہوت، لالچ، جاہ طلبی اور بوالہوسی میں مبتلا ہو گئے تھے (نعوذ باللہ) (۷) والٹیر (VOLTAIRE, FR) فرانسیسی مصنف زمانہ ۱۶۹۴ء تا ۱۷۷۸ء، اس نے پیغمبر اسلام صلعم کے بارہ میں اپنا مشہور ڈرامہ تحریر کیا، یہ ڈرامہ اگرچہ تاریخی لحاظ سے بے بنیاد تھا، تاہم یہ امر ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ اس وقت تک مستشرقین، شریعت اسلامی کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوئے تھے، یہ ڈرامہ ۱۷۴۲ء میں

منظرِ عام پر آیا، اس نے نہ صرف اسلام کے خلاف نفرت و حقارت کا اظہار کیا بلکہ یورپ کے ان تمام مستشرقین کی شدت کے ساتھ مذمت کی، جنھوں نے اسلام اور آنحضرت صلعم کی جانب نرمی کا رویہ اختیار کیا یا انصاف کا مطالبہ کیا، اس نے آنحضرت صلعم کو نبی کاذب اور اسلام کو وحشی اور فاسد مذہب سے موسوم کیا، اس نے ڈرامہ کو پوپ پانزدہم کے نام منسوب کیا اور اس کے مقدمہ میں اسلام کے خلاف خوب زہر اگلا، پھر اپنے مقالات کے مجموعہ (۱۷۵۶ء) میں بھی والٹیر نے آنحضرت صلعم اور اسلام کے خلاف سخت نفرت کا مظاہرہ کیا، والٹیر کی شخصیت اور تالیفات کا گہرا اثر دوسرے مستشرقین پر بھی پڑا چنانچہ ڈیڈی روٹ (DI.DEROT) اس فحش نگاری پر بھی اتر آیا کہ "محمد صلعم دنیا میں سب سے بڑھ کر عورتوں کے دوست اور سنجیدگی و معقولیت کے دشمن تھے (نعوذ باللہ)

تحریک استشراق کا عروج انیسویں صدی سے لیکر بیسویں صدی کے ربع اول تک کا زمانہ مسلمانوں اور مستشرقین دونوں کے لئے متعدد اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے، پچھلی صدیوں میں عالم اسلام کو دنیا کے مختلف حصوں میں سقوط و انحطاط کی جن منزلوں سے گزرنا پڑا تھا، ایک تو ان کے سبب ہی مسلمانوں کی حاکمانہ حیثیت ختم ہوئی، اس پر مستزاد یہ کہ ان کے پرانے حریف "مغرب" کو زمانۂ بیداری کے بعد سے سیاسی، عسکری، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی، ہر میدان میں مسلسل تفوق و بالادستی حاصل ہوتی چلی جا رہی تھی، اور اسکی سامراجی گرفت عہد بہ عہد مضبوط ہوتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ انیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے ادھر عالم اسلام خستہ اور زار ہوا اور ادھر مغرب کا پرچم استعمار اور بلند ہوا، یہ صورت حال مسلمانوں کے لئے کیسی ہی اذیت ناک کیوں نہ ہو، اقوام مغرب کیلئے بہر حال خوش آئند تھی، اور اس سے برابر کا فائدہ مستشرقین نے بھی اٹھایا، چنانچہ زیر نظر دور (۱۸۰۰ تا ۱۹۲۵) تحریک استشراق کے عروج و کمال سے عبارت ہے، اس عہد میں تحریک استشراق کو بھرپور فروغ حاصل ہوا، مستشرقین کے انداز و اطوار اگرچہ بدل گئے تاہم کیفیت و کمیت دونوں اعتبار سے ان کے اخلاف اپنے اسلاف پر بازی لے گئے، چنانچہ

(۱) کمیت کا اندازہ تو اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ زیر بحث دور میں مستشرقین کی ایک بہت بڑی تعداد سامنے آئی . اس میں ہر قسم کے مستشرقین شامل تھے، جو خاموش صلیبی جنگ

کے اس محاذ پر یورپ کے تقریباً تمام علاقوں کی نمائندگی کرنے والے تھے مثلاً فرانس، اٹلی، انگلستان، اسپین، پرتگال، آسٹریا، ہالینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ہنگری، روس، بلجیم، چیکوسلواکیہ، فن لینڈ وغیرہ اور امریکہ والے بھی شریک ہو گئے۔

(ب) کیفیت کے اعتبار سے مستشرقین نے تصنیفات کے ڈھیر لگا دیئے، ان کے مطالعہ اور تحقیق و تدقیق کا دائرہ بھی محدود نہ رہا بلکہ عقائد اسلام، قرآن، حدیث، سنت، فقہ، اجتہاد، عرب، اہل عرب اور احوال عرب، ترکوں اور عربوں کے تعلقات، اسلام کی اصلیت، اسلامی تہذیب و تمدن اور پیغمبر اسلام کی سیرت و سوانح وغیرہ پر کثرت سے لکھا گیا، اس دور میں مستشرقین کا معیار تحقیق و استدلال بھی بلند ہوا، اور تحقیق و جستجو اور تفتیش و تفحص میں انھوں نے ایسا کمال دکھایا، جو آج بھی باعث حیرت ہے، قدیم عربی مآخذ کی تلاش، مخطوطات اور قلمی نسخوں کی دریافت، آثار و اکتشافات قدیم کا مطالعہ، کتابوں کی تصحیح و اشاعت، اسلامی تاریخی مآخذ کی ترتیب و تدوین، فہرستوں، اشاریوں اور تبویب وغیرہ کی تیاری اور اسی طرح کی دوسری سرگرمیاں، ان کی محنت و ریاضت، علم شناسی اور مشرق نوازی کی روشن دلیل ہیں، بلکہ یہ ان کا مسلمانوں پر احسان ہے کہ ان ہی کی کوششوں کے طفیل بہت سی نادر اور مفقود الخبر کتابیں، مسلمانوں تک پھر سے پہونچیں اور مشہور و متعارف ہوئیں،

(ج) مستشرقین کے گروہ میں حسب سابق دونوں قسم کے افراد نے تصنیف و تالیف میں حصہ لیا، ایک طرف اگر روایتی قسم کے متشدد اور متعصب علمائے استشراق تھے تو دوسری طرف حقیقت بیں، انصاف پسند، نرم رو اور معتدل قسم کے مصنفین بھی تھے، مثلاً گاڈفرے ہگنز، کاسن دی پرسیوال، ڈیل، رینان، گوئٹے، شول، کارلائل اور ڈنگھم وغیرہ۔

(د) مستشرقین کے سلوک اور رویہ میں نکھار پیدا ہوا، اور بحیثیت مجموعی اس دور میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے ساتھ ان کا رویہ پہلے جیسا نہ رہا، بلکہ مختلف عوامل کے نتیجے میں نرم، حقیقت پسندانہ

اور معقول ہوتا چلا گیا، اس کی بظاہر وجہ ایک تو مشرقی مصادر تک ان کی رسائی، عربی اور دوسری مشرقی زبانوں سے واقفیت تھی کہ جس کے نتیجہ میں محض تخمین وظن کے بجائے وہ عقل و استدلال اور علم کی روشنی میں بات کرنے لگے، مشرقی ممالک کے مشاہدات و اسفار نے ان کے اپنے اسلاف کی لغویت ثابت کر دی اور بیان و واقعہ کا تضاد سامنے آ گیا، دوسری بڑی وجہ خود یورپ کی بدلتی ہوئی فضا تھی، نیز جدت پسندی سائنسی ایجادات و اختراعات، تعصب اور تقشف کے خلاف بے چینی، رومانی تحریک، کلاسیکی نظریات کے خلاف بغاوت، تاریخی تنقید کی تحریک وغیرہ بھی موثر عوامل ثابت ہوئے، ان باتوں کی روشنی میں گویا یہ کہنا درست ہوگا کہ مستشرقین کی اس فکری تبدیلی کی تہہ میں نہ تو اخلاص جلوہ گر تھا اور نہ کدورت و نفرت پر محبت و مودت کے جذبات غالب آ گئے تھے، بلکہ درحقیقت حالات کی ستم ظریفی نے انھیں نقطۂ نظر بدلنے پر مجبور کر دیا تھا، ورنہ ان کے اصل مقاصد میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، بہرحال اصل وجہ ہم کسی کو قرار دیں، واقعۃً عملاً یہ پیش آیا کہ:۔

(ا) اس دور میں ان کے بیان لغویات کم ہو گئیں اور الزامات و اتہامات کا دائرہ سمٹ کر محدود ہو گیا، نیز (اا) صورت حالات نے کلیسا کا طلسم توڑ کر ایسے مستشرقین بھی پیدا کر دیئے، جنھوں نے جرأت سے کام لیکر اپنے پیشرو مصنفین کی تغلیط کی، اور ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا۔

(ہ) اپنی سرگرمیوں کو منظم و مرتب کرنے کے ضمن میں مستشرقین نے اس دور میں متعدد تحقیقی ادارے قائم کئے مثلاً سوسائٹی ایشیاٹک آف پیرس ۱۸۲۲ء، رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ ۱۸۲۳ء اور امریکن اورینٹل سوسائٹی ۱۸۴۲ء وغیرہ، ان تمام اداروں نے جلد ہی اپنے جرائد نکالنا شروع کر دیئے جن سے ان کی تحریک کو بے پناہ تقویت حاصل ہوئی، لوگوں کے اذہان و قلوب کو متاثر کرنے میں رسائل و جرائد کو چونکہ ہمیشہ سے خاص اہمیت حاصل رہی ہے، اس لئے مذکورۂ بالا مجلات کی اشاعت کو کافی نہیں سمجھا گیا، بلکہ اپنی حکمت عملی کا مستقل حصہ بناتے ہوئے مستشرقین نے دوسرے متعدد

رسائل و جرائد کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا، چنانچہ ہندوستان سے (THE MUSLEM WORLD) کا اجرا، پیرس سے ۱۸۹۵ء میں (REVAE-DE-ISLAM) کا اجرا، روس سے ۱۹۱۲ء میں (MIR ISLAM) کا اجرا وغیرہ، رسائل و جرائد اور مجلات کی ان اشاعتی سرگرمیوں کا بظاہر مقصد تو یہ تھا کہ وہ اپنی تحقیقات سے دوسروں کو روشناس کرا سکیں، لیکن بہ باطن مدعا، اپنے پرانے استشراقی مقاصد کی تکمیل ہی تھا، رہی ان کی بلند آہنگی تو وہ صاف نتیجہ تھی اقوام یورپ کی بالادستی کا، اور استعماری تسلط کا، بہرحال اب منزل وہ بھی آئی کہ مستشرقین نے اپنی پہلی عالمی کانگرس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۸۷۳ء میں اسے پہلی بار علمی جامہ پہنایا گیا، عالمی کانگرسوں کا انعقاد بھی ان کے لئے بڑا مفید مطلب تھا، مختلف اداروں کی سرگرمیاں، کارکردگی، نتائج، اطلاعات کا تبادلہ، بڑے بڑے علماء و فضلاء کی شرکت، مقالات، خطبات، صلاح مشورے، قراردادیں وغیرہ، یہ سب باتیں تحریک استشراق کو فعال اور سرگرم بنانے کے لئے بہرحال ضروری تھیں اور مستشرقین نے اس پہلو کو تشنہ توجہ نہیں چھوڑا اور انیسویں صدی کے اواخر سے ہی سالانہ اجتماعات کو ایک روایت کے طور پر جاری کر دیا۔

بہرحال یہ تفصیل، اس اجمال کی تھی کہ انیسویں صدی سے لیکر بیسویں صدی کے ربع اول تک کا زمانہ تحریک استشراق کا دور عروج و کمال تھا اور پھر ہم نے دیکھا کہ تحریک کے تمام شعبوں میں انتہائی رفتار سے ترقی ہوئی، مستشرقین کا ایک مستقل رویہ اور سلوک نکھرتا چلا گیا اور بحیثیت مجموعی ان کی تمام سرگرمیاں نہایت منظم طریقہ سے، ہر سطح پر اپنے اثرات کو ظاہر کرتی رہیں، اسی عہد کی آخری دہائی میں اگرچہ عالمی جنگ اور بین الاقوامی سیاست اور متعدد واقعات و حوادث نے ایک مرتبہ پھر سیاسی، سماجی اور معاشی و ثقافتی حالات کا نقشہ بدل ڈالا، تاہم یہ جائزہ ہم آئندہ صفحات میں عہد جدید کے تحت لیں گے۔

(باقی)

ترکی کا ایک نامور صحافی

حافظ اشرف ادیب

۱۸۸۲ء تا ۱۹۷۱ء

از جناب صولت ثروت صاحب، کراچی

حافظ اشرف ادیب کا نام ترکی اور اسلامی صحافت کی تاریخ میں زریں حروف میں لکھے جانے کے لائق ہے، اگرچہ آج ترکی کے باہر بہت کم لوگ ان کے نام سے واقف ہیں، اور ترکی میں بھی ان کو بھلانے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن ایک زمانہ تھا کہ ان کا نام اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصے میں خصوصاً ترکوں کی دنیا میں ہر پڑھے لکھے شخص کی زبان پر تھا، ان کا ہفت روزہ "صراط مستقیم" جس کو بعد میں "سبیل الرشاد" کا نام دے دیا گیا تھا، ۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان شاید اسلامی دنیا کا سب سے کثیر الاشاعت ہفت روزہ تھا، جس کی اشاعت پچاس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ایک صحافی کی حیثیت سے ہم اشرف ادیب کو ترکی کا ابو الکلام آزاد کہہ سکتے ہیں، اس لحاظ سے کہ "سبیل الرشاد" اور "الہلال" دونوں ہمعصر بھی تھے اور اسلام کے نقیب بھی، یہ دوسری بات ہے کہ "الہلال" کی عمر بہت مختصر ہوئی، جب کہ سبیل الرشاد اور اس کے مالک کی عمر میں اللہ نے بڑی برکت دی،

اشرف ادیب کا خاندان مشرقی ترکی کے شہر سیواس سے تعلق رکھتا تھا، لیکن ان کے والد اسلام آغا نے انیسویں صدی کے آخر میں شہر سیریز میں رہائش اختیار کر لی تھی، جو

یونانی مقدونیہ کا ایک اہم شہر ہے، اور سالونیکا اور گوالا نامی شہروں کے درمیان ذرا
شمال کی طرف واقع ہے، اس زمانے میں یہ حصہ عثمانی سلطنت کا ایک حصہ تھا، مقدونیہ
۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان میں ترکوں کے ہاتھ سے نکلا، اب سیریز کو سرائے ([illegible])
کہا جاتا ہے، اور آبادی چالیس پچاس ہزار کے لگ بھگ ہے، لیکن مسلمانوں سے خالی ہوگیا ہے،

پیدائش | اشرف ادیب کی والدہ نفیسہ خانم کے خاندان کا تعلق ترکستان سے تھا اور
ان کے والد فرغانہ سے ہجرت کرکے آئے تھے، اور سیریز میں آباد ہوگئے تھے، ان کا یہاں
شیشے کے برتنوں کا کاروبار تھا، نفیسہ خانم نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، اور قرآن مجید کی
صحت کے ساتھ تلاوت کرسکتی تھیں، جبکہ اشرف ادیب کے والد پڑھے لکھے نہیں تھے، اور
درزی اور کپڑوں پر زری کڑھائی کا کام کرتے تھے، جس کی وجہ سے صرمہ کش[1] اسلام آغا
کہلاتے تھے، اشرف ادیب اسی شہر سیریز میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے تھے، جب
ترکی میں خاندانی نام کا قانون بنا تو ان کے نام کے آگے فرغن (Fergan) کا
اضافہ ہوگیا،

اشرف ادیب کا گھرانہ ایک خوشحال گھرانہ تھا، شہر میں بہت بڑا مکان تھا جس
میں زنانہ اور مردانہ حصے تھے، اور وسیع صحن اور باغ تھا، چشمے کا پانی پختہ مٹی
کی بلند نالیوں کے ذریعہ گھر کے زنانہ اور مردانہ دونوں حصوں میں آتا تھا، اور چونکہ یہ
پانی لذیذ، ہلکا اور صحت بخش ہوتا تھا، اس لیے محلے کے لوگ ان کے گھر سے پانی بھر کر
لے جاتے تھے، شہر سے باہر بھی ان کے کھیت اور باغ تھے، اشرف ادیب نے اپنی

[1] ترکی زبان میں سونے اور چاندی کے دھاگوں سے کشیدہ کاری کرنے والے
کو صرمہ کش کہا جاتا ہے،

خود نوشت[1] میں لکھا ہے کہ ہمارے کھیت کے بھٹے غیر معمولی طور پر بڑے ہوتے تھے، اور ان
کا طول چالیس تا پچاس[40] سینٹی میٹر تک ہوتا تھا، اور دانے نخود کے برابر ہوتے تھے، تربوز اور
خربوزے بھی ہوتے تھے، اور خربوزے آٹھ آٹھ دس دس سیر کے ہوتے تھے، باغ میں مختلف
پھلوں کے درخت تھے، انگور بہت پیدا ہوتا تھا، اشرف ادیب نے خاصی تفصیل سے لکھا ہے،
کہ پھلوں کے پکنے پر کس طرح جشن منایا جاتا تھا، انگوروں کو کس طرح توڑ کر گھر لایا جاتا تھا، لوگوں
میں تقسیم کیا جاتا تھا، کس طرح انکا عرق نکالا اور انگور کا شربت بنایا جاتا تھا، اور کس طرح
باغ میں تفریحی محفلیں جمتی تھیں، باغ کے قریب ہی پہاڑوں کے درمیان حصار اردی نام
کی ایک تفریح گاہ تھی، جہاں بلند و بالا درختوں کے درمیان چشمہ بہتا تھا، یہاں ہفتہ میں ایک
دن خواتین کے لیے مخصوص تھا، جب گھر کے لوگ وہاں تفریح کے لیے جاتے تھے، تو ایک دن
پہلے سے تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں، گھر پر ایک گائے تھی، جس کی وجہ سے دودھ، دہی
اور مکھن کی فراوانی تھی، اشرف ادیب کی والدہ خود دودھ دوہتی تھیں، شہر میں دستکاری
کے میلے بھی لگا کرتے تھے، سیریز کا بقلوا[2] بہت مشہور تھا، اور استنبول تک بھیجا جاتا
تھا، یہاں ایک مخصوص حلوا بھی تیار ہوتا تھا، جو چاول اور مکھن سے تیار کیا جاتا تھا، اشرف
ادیب لکھتے ہیں کہ رمضان کا زمانہ بڑی رونق کا زمانہ ہوتا تھا، اور وہ اپنے والد اور بڑے
بھائی کے ساتھ سیریز کی جامع مسجد میں تراویح پڑھنے پابندی کے ساتھ جاتے تھے، قاری

[1] یہ خود نوشت روزنامہ ینی آسیا استنبول میں ۵ جنوری ۱۹۷۸ء سے ۲۶ جنوری ۱۹۷۸ء
تک بائیس[22] قسطوں میں شائع ہوئی ہے، اشرف ادیب نے یہ حالات ینی آسیا کے مالک اور ناشر
مصطفےٰ پولاد متوفی ۱۹۷۸ء کے اصرار پر لکھنا شروع کیے تھے، ابھی ۱۹۱۲ء تک ہی پہنچے تھے کہ
۱۹۷۱ء میں اشرف ادیب کا بھی انتقال ہوگیا، سات سال بعد ان کی اشاعت ہوئی ہے،

[2] ایک قسم کی ترکی پیسٹری،

خوش الحان تھے اور کوئی غلطی نہیں کرتے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد تلاوت قرآن کا مقابلہ ہوتا تھا، اشرف ادیب نے بھی مقابلہ میں حصہ لے کر انعام حاصل کیا۔ اشرف ادیب نے اپنے آبائی وطن کی ان تمام باتوں کا بڑی حسرت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، اور آخر میں افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم نے گمراہی کا راستہ اختیار کیا جس کی وجہ سے ہمارا یہ وطن جو جنت کی طرح تھا، اور جسے سونے کی سرزمین کہا جاتا تھا، ہمارے ہاتھ سے ایسا نکلا کہ اب وہاں جا بھی نہیں سکتے، یہ ساری باتیں خواب و خیال بن گئیں"

ابتدائی تعلیم اشرف ادیب کے والد جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، پڑھے لکھے نہیں تھے، اور ان کو بیٹے کی تعلیم سے بھی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اچھے کپڑے پہننے اور شان کی زندگی گزارنے سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، لیکن ان کے برخلاف والدہ کو بیٹے کی تعلیم سے بہت دلچسپی تھی، اور انہوں نے اس معاملہ میں بڑی ذمہ داری اور ایثار کا ثبوت دیا، وہ بیٹے کی پڑھائی کی خود دیکھ بھال کرتی تھیں، بلکہ مدد دیتی تھیں، حکم تھا کہ مغرب کی اذان پر کھیل کو ختم کر دیا جائے اور سبق یاد کیا جائے،

اشرف ادیب نے اپنی بسم اللہ کی تقریب، ختنہ کی رسم اور حفظ قرآن کی تقریب کا بڑا دلچسپ حال لکھا ہے، انہوں نے ابتدائی اور رشدی مدرسہ کی تعلیم احمد پاشا مکتب میں حاصل کی، جو ان کے گھر سے ایک کیلومیٹر کے فاصلہ پر تھا، اس کے بعد انہوں نے قرآن حفظ کیا۔ قرآن حفظ کرنے کے لیے ان کے استاذ ابراہیم آفندی نے والدین کو آمادہ کیا تھا، حافظ قرآن بننے کے بعد جو تقریب ہوئی، اشرف ادیب نے اس کا حال تفصیل سے لکھا ہے، اس کے بعد وہ اعدادی مدرسہ میں داخل ہو گئے، جو کالج کے برابر سمجھا جاتا تھا، اشرف ادیب نے علوم عربیہ کے استاد مفتی زادہ عصام الدین آفندی اور حفظ قرآن کے

استاذ ابراہیم آفندی کا بڑی عقیدت، محبت اور احسان مندی کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، اور بتایا ہے کہ انہوں نے کس طرح قدم قدم پر ان کی حوصلہ افزائی کی، اعدادی مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ اشرف ادیب جامع مسجد میں عصام الدین آفندی کے درس میں بھی شرکت کرتے تھے، عصام الدین آفندی ایک مرتبہ ان کو مفتی صاحب کے دفتر کے کتب خانہ میں لے گئے، اور اس عظیم الشان کتب خانہ کو دکھا کر دعا دی کہ اللہ ایک دن تم کو بھی ایک ایسے کتب خانہ کا مالک بنا دے، اشرف ادیب تعطیل کے دنوں میں اس کتب خانہ سے استفادہ کرتے، یہاں جو علماء آتے ان سے عصام الدین آفندی اپنے شاگرد کا تعارف کراتے ہوئے کہتے کہ یہ ایک ذہین طالب علم ہیں۔ اشرف ادیب لکھتے ہیں کہ وہ جامع کے درس کے علاوہ خصوصی صحبتوں میں بھی فیضیاب کرتے تھے، اور اگر میں ایک ہفتہ ان کی ملاقات سے محروم ہو جاتا تو خلا محسوس کرتا تھا،

اس زمانہ میں ترکی ادب میں ایک نئی تحریک کا زور تھا، جو ادبیات جدیدہ کہلاتی تھی، چونکہ ادبیات جدیدہ کے ادیب اور شاعر رسالہ "ثروت فنون" کے گرد جمع ہو گئے تھے، اس لیے ادبیات جدیدہ کے اس دور کو جو ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۰ء تک رہا، ثروت فنون کا دور بھی کہا جاتا ہے، رسالہ ثروت فنون ۱۹۰۰ء میں سلطان عبدالحمید کے حکم سے بند کر دیا گیا، لیکن ادبیات جدیدہ کی تحریک جاری رہی، اور ۱۹۰۸ء میں جب ترکی میں مشروطیت یعنی آئینی حکومت قائم ہوئی تو یہی تحریک فجر آتی، یعنی آنے والی صبح کہلائی، ادبیات جدیدہ کے ادیب، ناول نگار اور شاعر فرانسیسی ادب سے بہت متاثر تھے، اور ان کی زبان میں عربی الفاظ اور محاورات کی بھرمار ہوتی تھی، ایک دفعہ اشرف ادیب نے ثروت فنون میں نئے ادیبوں کی ناولوں اور منظوم کلام کے مجموعوں کا اشتہار دیکھا، تو یہ کتابیں ڈاک سے

منگوالیں، ایک روز اشرف ادیب ان کتابوں کا مطالعہ کر رہے تھے، کہ ان کے استاذ عصام الدین آفندی نے ان کو دیکھ لیا، لیکن تادیب کرنے کی بجائے یہ مشورہ دیا کہ ادب کی کتابوں کا مطالعہ اچھا ہے، لیکن اپنے درس کی طرف سے غفلت کر کے ان کا مطالعہ نہیں کرنا چاہیے، اس کے بعد خود انہوں نے اشرف ادیب کو عہد تنظیمات کے بزرگ ادیبوں اور شاعروں نامق کمال، ضیا پاشا اور معلم ناجی کے منتخب اشعار لکھوائے، اور جب بھی موقع ملتا تو اشرف ادیب سے ادبی موضوعات پر گفتگو کرتے،

اشرف ادیب نے ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء میں اعدادیہ مدرسہ کی تعلیم مکمل کر لی اور انکو شہادت نامہ (سرٹیفکیٹ) مل گیا، اب ان کی خواہش یہ تھی کہ استنبول جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کریں، اور مدرسۂ قانون میں داخلہ لیں، لیکن ان کے استاذ نے ان کو محکمۂ شرعیہ میں (کاتب) کلرک) کی حیثیت سے ملازم کرا دیا، اس طرح ان کو مدرسۂ قانون میں داخلہ لینے میں ایک سال کی دیر ہو گئی، لیکن انہوں نے یہ مدت ضایع نہیں کی، مدرسۂ قانون میں داخلہ امتحان کے ذریعہ ہوتا تھا، اس لیے اشرف ادیب نے ملازمت کے ساتھ اس امتحان کی تیاری بھی شروع کر دی، ایک سال بعد ملازمت ترک کر کے انہوں نے استنبول جا کر ۱۹۰۲ء میں داخلہ کا امتحان دے دیا، اور اس میں کامیاب ہو گیے،

قانون کی تعلیم مدرسۂ قانون میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے اشرف ادیب کو استنبول آنا پڑا، انہوں نے ایک ہم جماعت کے ساتھ مل کر ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا، تعلیم پر پوری توجہ صرف کر دی، مدرسہ میں درسی کتابیں نہیں تھیں، صرف لیکچر دیئے جاتے تھے، اور طلبہ ان سے نوٹ تیار کرتے تھے، اشرف ادیب نے اتنا ملکہ پیدا کیا کہ وہ پوری تقریر ضبط تحریر میں لے آتے تھے، وہ لکھتے وقت نقطے نہیں لگاتے تھے، تاکہ جلدی لکھ سکیں، پھر بعد میں اپنی تحریر کو صاف کر لیتے

تھے، اس طرح پوری کتاب تیار ہو جاتی تھی، مدرسۂ قانون کے اساتذہ میں کئی ملک کی ممتاز ترین شخصیتیں تھیں، ان سے اشرف ادیب کے قریبی تعلقات قائم ہو گیے، ان میں ایک شیخ الاسلام موسیٰ کاظم[1] تھے، جو مجلہ[2] پر درس دیتے تھے، دوسرے اسماعیل حقی مناسترلی[3] تھے، جو اصول فقہ کے استاذ تھے، اشرف ادیب تعلیم کے زمانہ میں ممتاز علماء کے مواعظ میں بھی پابندی سے شرکت کرتے تھے، ان کے استاذ اسماعیل حقی جامع ایا صوفیہ میں پابندی سے وعظ کہا کرتے تھے، جو بڑے پسند کیے جاتے تھے، اشرف ادیب مدرسہ کے درس کی طرح ان کو بھی لکھ لیا کرتے تھے، اس طرح انہوں نے لیکچروں اور مواعظ کے کئی مجموعے تیار کر لیے، بعد میں جب انہوں نے اخبار صراط مستقیم جاری کیا، تو یہ لیکچر اور مواعظ اس میں بالاقساط شایع کیے اور بعد میں بعض کو کتابی شکل میں بھی شایع کیا، اس دلچسپی اور محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اشرف ادیب نے مدرسۂ قانون کے آخری امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی، اور ان کو ۱۹۰۶ء میں ڈاکٹریٹ کی سند دی گئی، اشرف ادیب اس کامیابی پر بہت خوش تھے، جب والدین کے پاس گھر گئے تو ماں کو تو خوش ہونا ہی تھا، باپ بھی بہت خوش ہوئے، اور اشرف ادیب کے الفاظ میں وہ خوشی میں سگرٹ کے کش پر کش لگائے جا رہے تھے، ایک سگریٹ ختم ہوتا تو دوسرا جلا لیتے تھے۔

---

[1] موسیٰ کاظم (۱۸۵۸ء تا ۱۹۲۰ء) سلطنت عثمانیہ میں ایک سو اکیسویں (۱۲۱) شیخ الاسلام تھے، ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۶ء کے درمیان تین مرتبہ مختصر مدت کیلئے شیخ الاسلام رہے، انجمن اتحاد و ترقی کے رکن بھی تھے، کئی کتابوں کے مؤلف اور مترجم بھی تھے، [2] مجلۂ احکام اسلامیہ، انیسویں صدی کے آخر میں جودت پاشا کی نگرانی میں جن اسلامی ضوابط کو دفعہ وار مرتب کیا گیا تھا، وہ "مجلہ" کہلاتا تھا، [3] اسماعیل حقی مناسترلی (۱۸۴۶ء تا ۱۹۱۲ء) ممتاز عالم اور مصنف اور عثمانی مجلسِ اعیان کے رکن تھے۔

ڈاکٹر بننے کے بعد اشرف ادیب کو مکتب قضاۃ میں معلم نامزد کر دیا گیا، لیکن انہوں نے کم عمری کی وجہ سے یہ پیش کش منظور نہیں کی، اسی زمانہ میں انہوں نے والدین کو بھی استنبول بلا لیا. شیخ الاسلام موسیٰ کاظم نے اپنی لڑکی سے اشرف ادیب کا نکاح کر دیا، لیکن پھر کسی غلط فہمی کی وجہ سے رخصتی سے قبل نکاح فسخ کر دیا گیا، اس کے بعد اشرف ادیب نے دوسری جگہ نکاح کیا، جس سے ان کے پانچ بچے ہوئے،[1]

استنبول آنے کے بعد اشرف ادیب کی سرگرمیوں میں بھی وسعت پیدا ہو گئی تھی، اور تعلقات بھی وسیع ہو گئے تھے. مدرسۂ قانون میں ان کے کئی ہم جماعت بعد میں بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر پہنچے، حتیٰ کہ وزیر بھی ہوئے. اسی زمانہ میں اشرف ادیب کو ملک کے سیاسی معاملات سے دلچسپی پیدا ہوئی، وہ مشہور انقلابی دانشور نامق کمال مرحوم سے بہت متاثر تھے، اور ان کی کتاب "رویا" کو جس پر پابندی لگی ہوئی تھی، چھپ چھپ کر پڑھتے تھے، اور اس کی وجہ سے وہ سلطان عبد الحمید کی استبدادی حکومت کے خلاف ہو گئے، انہوں نے "رویا" کو ہاتھ سے نقل کر کر کے لوگوں میں تقسیم کیا، اس زمانہ میں شیخ الاسلام موسیٰ کاظم اور اسماعیل حقی کے علاوہ جو ان کے اساتذہ تھے، اشرف ادیب کے جن ممتاز لوگوں سے تعلقات قائم ہوئے ان میں عباس حلیم پاشا،[2] محمد عاکف اور ابو العلاء ماردین کے نام اس لحاظ سے اہم ہیں کہ وہ اگلے سالوں میں اشرف ادیب کی صحافتی زندگی میں بہت مددگار

[1] اشرف ادیب کی خودنوشت ینی آسیا ۱۶ر جنوری سنہ ۱۹۷۸ء [2] عباس حلیم پاشا (سنہ ۱۹۶۶ تا سنہ ۱۹۳۴ء) محمد علی پاشا والی مصر کے پوتے اور وزیر اعظم سعید حلیم پاشا کے چھوٹے بھائی تھے، مخیر اور اہل علم کے قدرداں تھے، عاکف کی دل کھول کر سرپرستی کی وہ ان کو ولی نعمت کہکر مخاطب کرتے تھے، اور اپنے کلام میں جگہ جگہ ان کا تذکرہ کیا ہے،

ثابت ہوئے،

صراط مستقیم | ترکی اسلامی دنیا کا پہلا ملک ہے جہاں آئینی بادشاہت قائم کی گئی تھی، یہ حکومت نوجوان عثمانیوں کی کوشش سے جن میں نامق کمال، ضیا پاشا اور مدحت پاشا کے نام سرفہرست ہیں، ۲۰ر مارچ سنہ ۱۸۷۷ء کو قائم ہوئی تھی آئین کے تحت چھیانوے ۹۶ ممبروں پر مشتمل ایک پارلیمنٹ قائم کی گئی، جس میں چھپن ۵۶ مسلمان اور چالیس عیسائی ممبر تھے،[1] یہ پارلیمنٹ سلطان عبد الحمید (سنہ ۱۸۷۶ء تا سنہ ۱۹۰۹ء) کی تخت نشینی کے فوراً بعد ان ہی کے حکم سے قائم کی گئی تھی، لیکن ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ سلطان نے آئین معطل کر دیا، اور پارلیمنٹ برخاست کر دی، اس کے بعد سے سلطان عبد الحمید اور آئینی حکومت کے حامیوں کے درمیان مستقل کشمکش شروع ہو گئی، یہ کش مکش بالآخر سنہ ۱۹۰۸ء میں اس وقت ختم ہوئی جب فوج کے ایک گروہ نے جس میں نیازی بے اور انور پاشا نمایاں تھے، سلطان کو آئین بحال کرنے پر مجبور کیا، سنہ ۱۹۰۸ء میں چونکہ پہلی مشروطی (آئینی) حکومت بحال ہوئی تھی، اس لیے اس کو دوسری مشروطیت کہا جاتا ہے،

ایک ترک مصنف نے لکھا ہے کہ دوسری مشروطیت کا دور (سنہ ۱۹۰۸ء تا سنہ ۱۹۱۸ء) اگرچہ ایک مختصر دور ہے، لیکن ترکوں کے افکار کی تاریخ میں بہت اہم دور ہے، اس دور میں ایک عظیم سلطنت کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں ہر قسم کے سوالات زیر بحث آئے اور انکا جواب دینے کی کوشش کی گئی، یہ دور ترکی کے ماضی اور حال کے درمیان پل کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس زمانہ میں مشرق و مغرب کے درمیان امتزاج اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں دینی مسائل پر خوب بحث و مباحثے

[1] ثروت صولت: بدیع الزماں سعید نورسی ص ۴۷ (البدر پبلی کیشنز لاہور سنہ ۱۹۷۷ء)

ہوئے۔" (ڈاکٹر سلیمان خیری بولائے: ترکی میں روح اور مادہ کی کشمکش ص ۱۵-۱۶، استنبول ۱۹۷۹ء)

آئین بحال ہوتے ہی سیاسی سرگرمیوں کی آزادی مل گئی، اور صحافت پر عائد پابندیاں بھی ختم ہو گئیں۔ آزادی ملتے ہی گھٹے ہوئے جذبات نے ایک طوفان کی شکل اختیار کرلی، انجمن اتحاد و ترقی جس کی کوششوں سے آئینی انقلاب آیا تھا، متضاد قسم کے عناصر پر مشتمل تھی، پارٹی میں صرف سلطان عبدالحمید کے استبداد کے خلاف اتحاد تھا۔ اس کے ارکان میں کسی قسم کی نظریاتی وحدت نہیں تھی۔ اس میں مغرب پرست بھی تھے اور دینی عناصر بھی، ملحد اور آزاد خیال فری میسن بھی تھے۔ اور یہودیوں کو بھی پارٹی میں اچھا خاصا اثر حاصل تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک نے اپنا اپنا راگ الاپنا شروع کر دیا اسلام اور اس کی تعلیمات کے خلاف بھی آوازیں اٹھنے لگیں۔ اخبارات کیڑے مکوڑوں کی طرح نکل آئے، دوسری مشروطیت سے پہلے استنبول سے صرف چار اہم اخبار نکلتے تھے، ۲۳ جولائی ۱۹۰۸ء کو مشروطیت کی بحالی کا اعلان ہونے کے بعد اخباروں اور رسالوں کی تعداد تین سو ترپن (۳۵۳) تک پہنچ گئی،[۱]

اشرف ادیب نے بھی اس آزادی سے فائدہ اٹھایا، اور اپنے دوست ابوالعلاء ماردین کے ساتھ مل کر ایک ہفت روزہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اخبار کا نام "صراط مستقیم" رکھا گیا، محمد عاکف کو اس کا مدیر مقرر کیا گیا "صراط مستقیم" کا پہلا پرچہ ۱۱ اگست ۱۹۰۸ء کو نکلا، دوسری مشروطیت کے بعد نکلنے والے اخبار اور رسالوں میں سے بیشتر کی زندگی بہت مختصر ہوئی ۱۹۱۶ء تک ان کی تعداد ساڑھے تین سو سے گھٹ کر صرف آٹھ رہ گئی،[۲]

۱؎ تورک دلی و ادبیاتی انسی کلوپیدیسی جلد اول ص ۳۲۲ (استنبول ۱۹۷۷ء) ۲؎ ایضاً،

"صراط مستقیم" ان میں سب سے زیادہ جاندار اور پائیدار نکلا۔ ۵ مارچ ۱۹۲۵ء تک یہ ہفت روزہ شایع ہوتا رہا، اس مدت میں اس کی پچیس (۲۵) جلدیں اور چھ سو اکتالیس (۶۴۱) شمارے شایع ہوئے، ساڑھے تین سال تک "صراط مستقیم" کے نام سے شایع ہوتا رہا، اور اس مدت میں اس کی کل سات جلدیں نکلیں، پھر آٹھویں جلد سے (۱۹۱۲ء) نام "سبیل الرشاد" کر دیا گیا۔ اس مدت میں صرف پہلی عالمی جنگ کے بعد آزادی کی جنگ کے زمانہ میں غیر یقینی حالات کی وجہ سے اس کی اشاعت میں خلل پڑا، ورنہ ساری مدت پابندی سے نکلتا رہا، ۱۹۲۵ء میں قانون تحفظ عامہ کے تحت بند کر دیا گیا۔ لیکن جب ترکی میں ایک پارٹی کی حکومت کا دور ختم ہوا تو مئی ۱۹۴۸ء سے "سبیل الرشاد" پھر نکلنا شروع ہو گیا، اور ۱۹۷۱ء میں اشرف ادیب کی وفات تک جاری رہا،

اشرف ادیب نے اپنے ابتدائی دور کے ایک مقالے میں لکھا تھا۔ کہ ہم نے اسلام کو اس کے اصلی ماخذ سے نہیں بلکہ ماں باپ سے سیکھا ہے، اور اس طرح جو کچھ سنا اس کو دین سمجھتے ہیں، اس کے نتیجہ میں بے شمار خرافات، توہمات اور رسم و رواج دین میں داخل ہو گئے ہیں، جن کا اصل دین سے تعلق نہیں، ان غیر اسلامی عقائد کی وجہ سے ایک طبقہ میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا کہ دین ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ "صراط مستقیم" سے وابستہ لوگ اگر ایک طرف اس مرض کا علاج دین کے اصل سرچشمہ سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں، تو دوسری طرف وہ یوروپی افکار اور علوم سے بھی استفادہ کرنا چاہتے ہیں، (ڈاکٹر سلیمان خیری بولائے: ترکی میں روح اور مادہ کی کشمکش ص ۲۵ بحوالہ صراط مستقیم شمارہ ۱۰)

صراط مستقیم ایک ملی، اسلامی اور علمی پرچہ تھا۔ اس کا سیاست اور سیاسی پارٹیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دینا۔ اسلامی دنیا

خصوصاً سلطنت عثمانیہ اور روس میں آباد ترک باشندوں کے قومی حقوق کا تحفظ اس کے مقاصد میں سے تھے، ترکی کے ممتاز ترین اہل قلم اس میں مضامین لکھتے تھے، عربی اور دوسری زبانوں سے ترجمے بھی کیے جاتے تھے، محمد عبدہ، فرید وجدی اور دوسرے مصری علماء کے مضامین کے ترجمے شایع ہوتے تھے، فرید وجدی کی کتاب "مسلمان عورت" صراط مستقیم میں قسط وار شایع کی گئی، مولانا شبلی نعمانی نے مصر کے مسیحی مصنف جرجی زیدان کی کتاب تمدن اسلامی پر جو تنقید کی تھی، اس کا ترجمہ بھی صراط مستقیم میں شایع ہوا، مشہور دانشور اور سلطنت عثمانیہ کے وزیر اعظم سعید حلیم پاشا کے کئی مقالات جن میں ان کا شاہکار اسلام شمق (Islamization) بھی شامل ہے "سبیل الرشاد" میں شایع ہوئے، چند ممتاز ترک اہل قلم جو صراط مستقیم اور سبیل الرشاد میں پابندی سے لکھتے تھے حسب ذیل ہیں:

۱- ابوالعلاء ماردین: قانون کے پروفیسر تھے، اور اس موضوع پر متعدد کتابوں کے مصنف تھے،

۲- احمد نعیم: (۱۸۷۲ء تا ۱۹۳۴ء) استنبول یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر تھے، کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں "اسلام اور قومیت" اور "اسلامی اخلاق کی بنیادیں" اہم ہیں، ان کے علاوہ انہوں نے تجرید بخاری کا ترکی میں ترجمہ بھی کیا تھا،

۳- عمر فرید قام (۱۸۶۱ء تا ۱۹۴۴ء) یونیورسٹی میں تاریخ ادب کے پروفیسر تھے، تصوف، فلسفہ اور ادب خاص موضوع تھا، اور اس پر متعدد کتابیں لکھیں، ترکی کے علاوہ فارسی کے اچھے شاعر تھے،

۴- اسماعیل حقی مناسترلی (۱۸۴۶ء تا ۱۹۱۲ء) اپنے وقت کے ممتاز عالم دین تھے، مدرسۂ قانون میں فقہ کے استاد تھے، اسلامی موضوعات پر کئی کتابوں کے مصنف تھے،

۵- اسماعیل حقی ازمیرلی (۱۸۶۹ء تا ۱۹۴۶ء) یونیورسٹی کے پروفیسر تھے، فلسفہ اور تاریخ ادیان خاص موضوع تھے، تقریباً چونتیس کتابوں کے مصنف تھے،

۶- شمس الدین گونالتای (۱۸۸۳ء تا ۱۹۶۱ء) یونیورسٹی کے پروفیسر تھے، تاریخ کے موضوع پر بکثرت کتابیں لکھیں، بعد میں ترکی کی انجمن تاریخ کے صدر اور ۱۶ جنوری ۱۹۴۹ء سے ۲۲ فروری ۱۹۵۰ء تک مختصر مدت کے لیے ترکی کے وزیر اعظم بھی رہے،

۷- شیخ الاسلام مصطفےٰ صبری (۱۸۶۹ء تا ۱۹۵۴ء) عربی اور ترکی میں کئی کتابوں کے مصنف تھے، دینی مجددلر (دینی مجدد) ان کی مشہور کتاب ہے،

۸- محمد حمدی الملالی (۱۸۷۹ء تا ۱۹۴۲ء) ممتاز عالم دین تھے، ترکی زبان میں آٹھ جلدوں پر مشتمل تفسیر قرآن کے مؤلف تھے،

۹- مدحت جمال قونتای (۱۸۸۵ء تا ۱۹۵۶ء) ممتاز شاعر اور ادیب تھے، نامق کمال اور عاکف پر دو دو جلدوں پر مشتمل کتابوں کے مصنف تھے،

۱۰- محمد طاہر برصالی (۱۸۶۱ء تا ۱۹۲۶ء) دینی، ادبی اور تاریخی موضوعات پر کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں "عثمانلی مؤلفلری" (عثمانی دور کے مؤلف) جو تین ضخیم جلدوں میں ہے، سب سے مشہور ہے،

ان کے علاوہ شیخ الاسلام موسیٰ کاظم بھی (جن کا تذکرہ گزر چکا ہے) "صراط مستقیم" کے مستقل مضمون نگاروں میں تھے،

اسلام ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے یا نہیں، اسلام کی تعلیمات عقل کے مطابق ہیں یا نہیں، اسلام میں عورتوں کی حیثیت، تعدد ازدواج، پردہ، قرآن اللہ کا کلام ہے یا نہیں، اور اس قسم کے دوسرے موضوعات پر صراط مستقیم میں مسلسل مضامین شایع

ہوتے تھے، مباحثے چلتے تھے، اور اعتراض کرنے والوں کو مدلل جواب دیئے جاتے تھے۔

اگرچہ محمد عاکف "صراط مستقیم" کے مدیر تھے، اور پرچے کو مقبول بنانے میں ان کا حصہ کچھ کم نہ تھا، لیکن پرچے کی اصل روح رواں اشرف ادیب ہی تھے جو مالک اور ناشر تھے، وہ خود بھی مضامین لکھتے تھے اور مضامین حاصل کرنے کا انتظام کرتے تھے۔ عاکف سرکاری ملازم تھے اور کار منصبی کے سلسلہ میں ان کو مستقل باہر رہنا پڑتا تھا، لیکن اشرف ادیب ہر وقت دفتر میں موجود رہتے تھے، طبیعت میں انکساری تھی، اس لیے کبھی اپنی تعریف نہیں کی، اگر کبھی اپنی خدمات کا تذکرہ کرتے تھے تو اپنا نام لینے کی بجائے صراط مستقیم اور سبیل الرشاد کا نام لیتے تھے۔

پیچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ مشروطیت کا اعلان ہونے کے ساتھ ہی مغرب زدہ ترکوں کے ایک طبقہ نے اسلام پر اعتراضات شروع کر دیے تھے، ان میں آئینی انقلاب کے ایک ممتاز رہنما احمد رضا (۱۸۵۹ء تا ۱۹۳۰ء) کی صاحبزادی سلمیٰ خانم بہت پیش پیش تھیں۔ انہوں نے پیرس میں تعلیم حاصل کی تھی، اور طلاق، تعدد ازدواج اور دوسرے اسلامی شعار اور روایات پر مسلسل حملے کر رہی تھیں۔ ان کی اس ہرزہ سرائی کے خلاف ایک طرف صراط مستقیم میں خطوط اور تاروں کا سیلاب آگیا، تو دوسری طرف انور پاشا اور نیازی بے سے جو مشروطیت کے معمار تھے، شکایتیں کرنا اور جواب طلب کرنا شروع کر دیا، کہ کیا مشروطیت لانے کا یہی مقصد تھا، اور کیا حکومت اس قسم کے خیالات کی تائید کرتی ہے۔ جب یہ شکایتیں پہنچیں تو نیازی بے نے ان کا جواب صراط مستقیم ہی میں دیا[1]۔ کیونکہ یہ اخبار ساری عثمانی سلطنت میں پڑھا جاتا تھا، اور اس کی اشاعت چالیس

[1] اشرف ادیب کی خودنوشت، نبی آسیا، استنبول ۱۹؍جنوری ۱۹۷۸ء

پچاس ہزار تک پہنچ گئی تھی[1]۔

صراط مستقیم اپنی سادہ اور آسان زبان کی وجہ سے صرف خلافت عثمانیہ کی حدود ہی میں نہیں پڑھا جاتا تھا، بلکہ روس کے ترکی النسل مسلمان بھی اس کو ذوق و شوق سے پڑھتے تھے، اور ممتاز ترک ادیب احمد کبکلی کے الفاظ میں مشروطیت پہلی عالمی جنگ اور ترکی کی جنگ آزادی کے زمانے میں (۱۹۰۸ء تا ۱۹۲۲ء) سب سے طاقتور اسلامی جریدہ صراط مستقیم تھا[2]۔

روس میں مقبولیت روس میں "صراط مستقیم" کی مقبولیت کے بارے میں اشرف ادیب اپنی کتاب "محمد عاکف" میں لکھتے ہیں کہ

"صراط مستقیم" عالم اسلام کے ہر حصے میں پھیلنا شروع ہو گیا، خاص طور پر اس کے کئی ہزار نسخے روس جاتے تھے، ایشیا کے دور دراز گوشوں سے عاکف کے پاس خطوط آتے تھے، جس میں رسالے میں شائع ہونے والے مضامین نظم و نثر کی تعریف کی جاتی تھی، ان کی تحریریں روسی مسلمانوں کے درمیان چونکہ بہت دلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں، اس لیے زار کی حکومت "صراط مستقیم" کو خطرناک تصور کرتی تھی، اور اس کے داخلے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالتی تھی، کبھی خریداروں کو پرچہ نہیں پہنچایا جاتا تھا، اور کبھی مہمل بہانوں کا سہارا لے کر سنسر کے حوالے کر دیا جاتا تھا، اور اس کی پارسل کی پارسل واپس کر دی جاتی تھیں، لیکن عاکف کی شہرت پورے روس میں پھیل گئی تھی، اور وہاں کے ادیب اور اہل قلم اپنے اور ان کے درمیان روحانی تعلق محسوس کرتے تھے، چنانچہ روس سے جو ادیب اور اہل قلم

[1] اشرف ادیب کی خودنوشت، نبی آسیا، استنبول ۱۹؍جنوری ۱۹۷۸ء [2] احمد کبکلی: محمد عاکف ص ۱۱ (استنبول ۱۹۷۲ء)

استنبول آتے وہ سیدھے "صراط مستقیم" کے دفتر پہنچتے تھے، عاکف کو تلاش کرتے اور ان سے ملاقات کرتے، عبدالرشید ابراہیم[1]، یوسف آقچورہ[2]، اسماعیل گسپرالی، اور عیاض اسحاقی جیسے روسی ترک، روسی مسلمانوں کے بارے میں قیمتی اور مفید مضامین "صراط مستقیم" میں اشاعت کے لیے بھیجتے تھے"۔

آغا احمد آغا اوغلو[3]، جو حال ہی میں آذر بائیجان سے ترکی آئے تھے، اپنا زیادہ وقت عاکف کے ساتھ کام کرنے میں صرف کرتے تھے، ان کے قیمتی مقالے اور مضامین صراط مستقیم میں شایع ہوتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"اس زمانہ میں "صراط مستقیم" ہمارے آذر بائیجان کے علاقوں میں بہت پڑھا جاتا تھا ہم لوگوں نے حسین زادہ علی بے کے ساتھ مشروطیت سے چار پانچ سال قبل (سنہ ۱۹۰۳ء یا سنہ ۱۹۰۴ء) ایک اخبار نکالنا شروع کیا تھا، اس موقع پر ہماری نظر "صراط مستقیم" پر پڑی جو ترکی اور بیرون ترکی کے مسلمانوں کے درمیان ربط و تعلق قائم کرنے سے متعلق سنجیدہ اور اہم مضامین شایع کر رہا تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ یہ پرچہ اسلامی بنیادوں کے تحفظ کے ساتھ جدید نظریات کو پیش کرنے میں جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کے راستے پر چل رہا ہے۔

---

[1] عبدالرشید ابراہیم (سنہ ۱۸۵۰ء تا سنہ ۱۹۴۴ء) روس کے ترک مہاجر اور سیاح، جاپان میں اسلام کی اشاعت کی، دنیائے اسلام کے نام سے دو جلدوں میں اپنا سفرنامہ لکھا۔ [2] یوسف آقچورہ (سنہ ۱۸۷۶ء تا سنہ ۱۹۳۵ء)، اسماعیل گسپرالی (سنہ ۱۸۵۱ء تا سنہ ۱۹۱۴ء) اور عیاض اسحاقی (سنہ ۱۸۷۸ء تا سنہ ۱۹۵۴ء) تینوں روسی مسلمانوں کے نامور رہنما تھے، اسماعیل گسپرالی کریمیا کے رہنے والے تھے، اور روسی مسلمانوں کے سرسید کہے جا سکتے ہیں، [3] آغا اوغلو احمد (سنہ ۱۸۶۹ء تا سنہ ۱۹۳۹ء) روسی آذربائیجان کے ممتاز رہنما اور دانشور تھے، سنہ ۱۹۰۹ء میں ہجرت کر کے ترکی آ گئے تھے،

ہم اس اخبار کو پوری توجہ سے پڑھتے تھے، اور اس کے اقتباسات شایع کرتے تھے[1]۔

ترک انجمن | احمد آغا اوغلو کی مذکورہ بالا تحریر کا اقتباس دینے کے بعد اشرف ادیب لکھتے ہیں کہ:

"صراط مستقیم" میں ترکی النسل مسلمانوں کے بارے میں مضامین کی اشاعت سے ترکوں کی دنیا میں بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، ہماری مملکت میں جن لوگوں کو دنیائے ترک کے مطالعہ سے دلچسپی تھی، انہوں نے ان مضامین پر خاص توجہ دی، اور اس کے نتیجے میں دارالفنون اور مکتب ملکیہ کی عمارت میں ایک اجتماع کیا گیا جس میں (اشرف ادیب بھی شریک تھا، اس اجتماع میں تورک دَرنیگی کے نام سے ایک علمی جمعیت قائم کی گئی، جمعیت کا مقصد دنیا بھر کے ترکوں کے ماضی اور حال کے بارے میں تحقیقات کرنا، اور پھر ان معلومات کو ساری دنیا میں عام کرنا تھا، علاوہ ازیں ہمارا مقصد یہ بھی تھا کہ ترکی زبان کو سادہ اور آسان بنایا جائے، جمعیت کے بنیادی قواعد و ضوابط بھی اسی اجتماع میں مرتب کیے گئے، اور اس میں ایک انتظامی کمیٹی کا انتخاب عمل میں آیا، جمعیت کے نقطۂ نظر کو عام کرنے کے لیے "صراط مستقیم" کو پسند کیا گیا، "صراط مستقیم" نے بھی اس بات پر تشکر کا اظہار کیا، اور جمعیت (تورک درنیگی) کے قیام پر تمام عالم اسلام کو مبارکباد دی[2]۔

ترک درنیگی (انجمن ترک) اس لحاظ سے ترکی کی تاریخ میں اہمیت رکھتی ہے، کہ وہ ترکی میں پہلی علمی اور تحقیقی جمعیت تھی، جو خاص ترکوں سے مخصوص تھی، یہ جمعیت سنہ ۱۹۰۸ء میں قائم کی گئی تھی، اشرف ادیب نے اس کے بانیوں کے نام نہیں لکھے، لیکن کمال قرہ علی اوغلو نے اپنی کتاب تاریخ ادب ترکی جلد سوم[3] میں اس سلسلہ میں حسب ذیل نام دیے ہیں:

---

[1] احمد کبکلی: محمد عاکف، ص ۱۳، استنبول سنہ ۱۹۷۲ء) [2] ایضاً ص ۱۴ بحوالہ صراط مستقیم ص ۳۱۸، [3] سید کمال قرہ علی اوغلو: تورک ادبیاتی تاریخی جلد سوم ص ۵۲۸ (استنبول سنہ ۱۹۸۰ء)

احمد مدحت، امراللہ آفندی، نجیب عاصم، برصالی طاہر، کورک مازاوغلو جلال، ولد چلیبی، اچاراوغلو یوسف (آقچورہ یوسف) مورخ عارف، آق یگت اوغلو موسیٰ، احمد فرید، فوادرئیف اور رضا توفیق،

معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں ترک قوم پرست اس جمعیت کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال نہیں کرسکے، اور انہوں نے ۲۰ جون ۱۹۱۱ء کو "تورک اوجاغی" کے نام سے نئی جمعیت قائم کی، اور اس کی طرف سے "تورک یوردو" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا،

ترک قوم پرستوں نے فری میسن تحریک کے اثرات بڑھتے جارہے تھے، یہودیوں کی ایک خفیہ سازش کے تحت جس کا ان کو علم نہیں تھا، سلطان عبدالحمید کو ۲۷ اپریل ۱۹۰۹ء کو معزول کردیا، اس کے بعد ترک قوم پرستوں میں اختلافات بڑھتے گیے، جن سے فائدہ اٹھا کر اپریل ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کرلیا، اور ۱۹۱۲ء میں بلقان کی تمام ریاستوں نے مل کر ترکی پر حملہ کردیا، اس زمانہ میں "صراط مستقیم" ایک طرف جہاد کی اور دوسری طرف مسلمانوں کو اتحاد کی دعوت دیتا رہا، اخبار میں ساری دنیا کے مسلمانوں کا ردعمل شایع ہوتا تھا، جس میں ہندوستان کے مسلمانوں کا ردعمل بھی شامل ہوتا تھا، جن کے "صراط مستقیم" میں مسلسل تار آتے رہتے تھے، عاکف اپنی پرجوش نظموں سے حوصلے بڑھاتے تھے،

اسی زمانہ میں رشید رضا مصری استنبول آئے، وہ فری میسن تحریک کے جواب میں تحریک "دعوت وارشاد" قائم کرنا چاہتے تھے، انھوں نے انجمن اتحاد وترقی کے رہنماؤں کے سامنے یہ تجویز رکھی لیکن انھوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی، رشید رضا مایوس ہوکر مصر چلے گئے اور انھوں نے وہاں دعوت وارشاد کی بنیاد ڈالی، عباس حلیم پاشا کے چھوٹے بھائی پرنس محمد علی نے تحریک کو ایک ہزار (۱۰۰۰) پونڈ دیئے، بمبئی کے ایک تاجر قاسم بن محمد نے بیس ہزار (۲۰۰۰۰) پونڈ دیئے، صراط مستقیم نے اس جمعیت کے پروگرام کو کئی اشاعتوں میں نمایاں طور پر شایع کیا، (اشرف ادیب کی خودنوشت اینی آسیا ۲۰ اور ۲۱ جنوری ۱۹۷۰ء)

(باقی)

صغانی کی عربی شاعری

از ڈاکٹر حامد علی خاں ریڈر شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۲)

شعرگوئی میں صغانی کا مرتبہ نہایت بلند تھا، وہ ایک فصیح وبلیغ اور قادرالکلام شاعر تھے، اور حسب ضرورت وموقع برجستہ اشعار بھی کہتے، ان کے حالات اور تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ علوم وفنون اور لغت وادب کے امام تھے، علاوہ ازیں ان کی زندگی کا طویل حصہ عرب ممالک میں گذرا، محاورات پر عبور حاصل کرنے کے لئے سرزمین نجد میں پانچ برس قیام کیا، اور عمر بھر درس وتدریس کے محبوب ترین شغل سے وابستہ رہے، اس لئے کلام شعری عیوب سے پاک اور صنائع وبدائع اور محاسن شعری سے لبریز ہے، اس میں جزالت اور جاہلی شاعری کی طرح رفعت وشوکت عظمت اور آمد ہی آمد ہے، اور آورد کا کوئی نام بھی نہیں ہے، البتہ ان کی نثر ونظم دونوں ہی مشکل اور نادر لغات سے گرانبار ہیں، مگر اس میں تصنع کو بالکل دخل نہیں ہے کیونکہ وہ لغات عرب کے ایک بحر ناپیداکنار تھے،

الخجندی نے اپنے شیخ ابوالعباس احمد بن علی سرودی سے نقل کیا ہے کہ سرودی کو اس کے والد نے بتایا تھا کہ انھوں نے صغانی کے کثیر اشعار کو سنا تھا، مگر غالباً نہ تو صغانی نے از خود اپنے کلام کو محفوظ رکھا، اور نہ ان کی وفات کے بعد کسی نے ان کے کلام کی تدوین وحفاظت کی طرف توجہ کی، اس لئے ان کے کلام کا کوئی مرتب مجموعہ موجود نہیں ہے، حالانکہ اگر تمام کلام محفوظ ہوتا تو ان کا دیوان کافی ضخیم ہوتا، زیادہ تر کلام ضائع ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ عوام کی دسترس سے بالاتر تھا، اور صرف عظیم فضلا ہی اس سے استفادہ کرسکتے تھے، راقم کو مختلف مآخذ سے صرف ایک سو اکتالیس اشعار

دستیاب ہو سکے ہیں، ان تمام اشعار کو ضروری تشریح کے ساتھ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے، تاکہ صغانی کا دستیاب شدہ کلام ایک جا ہو جائے۔

اوپر گذر چکا ہے کہ ملکہ رضیہ کے عہدِ حکومت میں علامہ صغانی ہندوستان میں قیام سے بیزار ہو گئے تھے، فرائض سفارت سے سبکدوشی کے لئے اپنے فرزندوں کو بھی متوجہ کیا، اور انھوں نے امکان بھر کوشش کی، مگر کامیابی نہیں ہوئی، ان حالات سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک قصیدہ لکھا جو عربی زبان میں ادبی حیثیت سے منفرد اور ہندوستان میں اپنے طرز کا اولین قصیدہ ہے، اس میں لفظی و معنوی صنائع کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے حالات بھی تحریر کئے ہیں، اور زمانے کی ناسازگاری کا ذکر بھی کیا ہے، یہ شاعرانہ انداز میں ان کی آپ بیتی ہے، اُنسٹھ[59] اشعار پر مشتمل یہ پورا قصیدہ صنعتِ تجنیس میں ہے:-

انسانی الدھر اعطانی واوطانی　　وحطنی دوھاد الخسف اوطانی

(زمانے نے میرے دل سے میرے وطن اور میری نشستگاہوں کی یاد کو فراموش کر دیا اور مجھے قعرِ ذلت میں گرا کر روند ڈالا)

وکنت افنیت عمری فی رفاھیۃ　　فعظنی ولذیذ العیش انسانی

(حالانکہ میں نے اپنی زندگی عیش و عشرت میں گذاری تھی، پھر اس نے مجھے تکلیف پہنچائی، اور میری خوشگوار اور مرفہ الحال زندگی کو بھلا دیا)

وکان قدمنی قدرًا واکرمنی　　فالآن اخرنی عذرًا وانسانی

(اگرچہ اُس نے میری بڑی عزت افزائی کی تھی، اور وہ میرا بڑا اکرام کرتا تھا لیکن اب اس نے مجھ سے بے وفائی کرتے ہوئے مجھے پیچھے کر دیا، اور چھوڑ دیا)

وکم غنیت بمغنی العز ذا شرف　　اجرنی المجد اذیالی واردانی

(میں اعزاز کے ساتھ عظیم الشان، اور باعزت محلوں میں رہتا تھا، اور عظمت و بزرگی کے ساتھ نہایت

فارغ البال زندگی بسر کرتا تھا)

لا استکین لسلطان ولا ملک　　بعظمہ فردانی ثم اردانی

(میں کسی بھی بادشاہ کے جاہ و جلال کی وجہ سے اس کے سامنے سرنگوں نہیں ہوا، مگر زمانے نے مجھے ہلاک و برباد کر دیا)

احل اھلی خرابًا بائرًا معرًا　　کاننی لم اقم یومًا بعمرانی

(زمانے نے میرے متعلقین کو غیر آباد اور ویران زمین میں فروکش کر دیا ہے، گویا کہ میں آبادی میں ایک دن بھی اقامت گزیں نہیں رہا ہوں)

وصک بالجدب ابیاتی وصاغیتی　　من بعد ما مربی فی الخصب عمرانی

(ظالم زمانے نے اب میرے مکانات اور مجھ پر تکیہ کرنے والے لوگوں کے لئے خشک سالی اور پریشان حالی کا پتہ لکھ دیا ہے، حالانکہ میری زندگی کے دو دور نہایت خوشحالی اور فارغ البالی میں گذر چکے ہیں)

وردنی خائبًا صفر الیدین لقی　　من بعد ما کان بالترحیب حیانی

(اس نے مجھے گری پڑی چیز کی طرح نامراد اور خالی ہاتھ واپس کر دیا، حالانکہ اس سے پہلے وہ مجھے خوش آمدید و عمر دراز باد کہہ چکا تھا)

وکان احیاء ھذا الصقع لی تبعًا　　فھل یدین من الاحیاء حیان

(اس دنیا کے سب ہی رہنے والے میرے فرمانبردار تھے، مگر اب یہ حالت ہے کہ کوئی دو شخص بھی میری اطاعت کرنے والے نہیں ہیں)

ومسنی بالیم الضر معتسفا　　لما طوی لی اعوانی واعیانی

(اس نے ظلم پر کمربستہ ہو کر مجھے بڑی دردناک تکلیف پہنچائی ہے، جبکہ اس نے میرے سرداروں اور ممتاز ساتھیوں کو مار ڈالا ہے)

وکنت أُعمی زماناً عزۃً وسنا فارہقنی جورُ زمان السوٗ أعیانی

(میں زمانے کو عزت و وقار کے اعتبار سے تھکا چکا تھا، اور اب زمانۂ بد کے ظلم وستم نے مجھے تھکا ڈالا ہے)

وکان لو خضعت نفسی لترضیۃ أَلقی القیاد فأعلانی وأسمانی

(اگر میرا نفس اس کی رضاجوئی کی خاطر اس کے سامنے سرنگوں ہوگیا ہوتا، تو وہ قیادت

کی باگ میرے ہاتھ میں دیتا، مجھے بلند و بالا بناتا اور مجھے بام عروج پر پہنچاتا)

فالآن لمّا رأی فقری ومسکنتی أَعلّنی وعلیل السوءِ أسمانی

(لیکن اب جبکہ اسے میرے فقر و فاقہ میں مبتلا ہونے کا یقین ہوگیا، تو اس نے مجھے بیمار بنا دیا اور

مجھے بدترین بیمار کا نام دیا،)

وحین کنت حدیث السن ذا اشر منی عطائی واغنانی واسنانی

(جس وقت میں نو عمر اور سخت فراخ تھا، تو اس نے مجھے انعامات سے سرفراز کیا غنی اور تونگر بنایا

اور مجھے ممتاز و نمایاں کیا،)

ثم ازدرانی اخیراً والحی غصنی من بعد ما نغضت للشیب لسنانی

(پھر اس نے آخر میں مجھے حقیر اور ناکارہ بنا دیا، اور میری شاخوں (یعنی گوشت پوست) کو

نوچنا شروع کردیا، حالانکہ بڑھاپے کی وجہ سے میرے دانت ہلنا شروع ہوگئے اور خراب ہوگئے تھے

وکان دوحۃ عیشی غضۃ منا غضیرۃ ذات اغصان وافنانی

(میرے عیش کا برگ و بار والا درخت عرصۂ دراز تک تر و تازہ رہا اور ہر ایک نعمت سے لطف اندوز ہوا

حتی اذا ماحنی الدھر الملم قنا قدلی وقلادیر العمر اقنانی

(یہاں تک کہ جب مصائب ڈھانے والا اجنبیت کا مرتکب ہوا تو میرا قدیم قد و قامت فنا ہوگیا،

اور ظاہری عمر کے بڑھنے نے مجھے شیخ فانی بنادیا)

وکنت مھما ارتجلت الشعر مقتضباً یزری علی ابن ابی سلمی وحسان

(جس وقت میں فی البدیہہ شعر کہتا تھا تو اس کے مقابلے میں زہیر بن ابی سلمی اور حضرت حسانؓ کے

شعر بے حقیقت معلوم ہوتے تھے)

فالآن انی لا عیی الناس قاطبۃً مذ ضامنی وجمیع الضیم حسّانی

(مگر جب سے زمانے نے مجھ پر ظلم کیا ہے، اور ہر طرح کا ظلم مجھے گھونٹ گھونٹ کرکے پلایا ہے تو

میں تمام لوگوں میں زیادہ تھکا ماندہ اور عاجز ہوگیا ہوں)

وکان قصری من وافاہ قال لہ یا بانی القصر نعم القصر والبانی

(میرا محل ایسا عظیم الشان تھا کہ جو آتا اور اس کو دیکھتا تو یہ کہتا کہ محل بنانے والا اور محل دونوں

خوب ہیں)

فھدّہ الدھر ھدّاً لانظام لہ ضرب المعول غصن الطلح والبان

(لیکن زمانے نے اس کو بڑی بدنظمی اور بے ڈھنگے طریقے سے اس طرح منہدم کردیا جیسا کہ

کدال والا ببول اور بان کی شاخوں پر ضرب لگا کر انھیں ختم کرتا ہے)

وکنت أمسی وابوابی مفتحۃٌ وکنت اصبح ذا صفح وغفران

(پہلے جب شام ہوتی تو میرے دروازے لوگوں کی فریادرسی اور مہمان نوازی کے لئے کھلے رہتے

تھے، اور میں دن میں ان سے عفو و درگذر سے کام لیتا تھا)

مذ نبا المرتع الماھول آنسنی فی داس شاھقۃ خلفاء غفران

(مگر جس وقت سے آباد اور سرسبز و شاداب مقامات مجھ سے برہم ہوئے، تو اس وقت سے

منحوس زمانے نے مجھے یمن کے دو مشہور قلعوں کے درمیان حکنی اور بلند پہاڑ کی چوٹی سے مانوس

بنا دیا یعنی اب بنجر اور ویران زمینوں میں زندگی گزارنا پڑ رہی ہے)

ولی ببغداد دار العزّ دامر بہا		ظِلّ الامام الرضی المستنصر ابتان

(عزت و شرافت کے مقام بغداد پر ہمیشہ ہر دل عزیز خلیفہ مستنصر باللہ کا سایہ رہے، اس میں میرے دو بیٹے سکونت پذیر ہیں)

(ا وھان الآن کرھا لاطوعیۃ		بالھند والسند ذو عدن وابنان

(اب میں اپنی خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری کے تحت سندھ و ہند میں اقامت گزیں ہوں حالانکہ میں عدن میں اپنے بیٹوں کے ساتھ رہ چکا ہوں)

وکنت اسیر فی الآفاق من ملاءٍ		ففرق الدھر افراسی وارسانی

(میں رفقاء کی جماعت کے ساتھ عالم کی سیر کیا کرتا تھا، مگر گردشِ دوراں نے میرے شہسواروں کو مجھ سے جدا کر دیا، اور مجھے ایک جگہ مقیم بنا دیا)

وکان لی وُصَل عند الملوک معًا		حتی تقضبتْ أفراسی وارسانی

(پہلے بیک وقت بہت سے بادشاہوں سے میرے تعلقات تھے، یہاں تک کہ اے ظالم دہر تونے میرے سب گھوڑوں کو فنا کر دیا، اور ان کی باگوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا)

وکان مسرحُ عینی ذا طوی فغدا		مراھبی حمی ارباب مکوان

(میری نظر کے سامنے ہر طرح کی سبزی پر مشتمل اور گھنی چراگاہ تھی، اور جانوروں کی رہائش گاہ صوبہ بلوچستان کے مکران نامی ساحلی علاقے کے باشندوں کی طرح محفوظ تھی)

وقد دھانی مکو منہ فی صغری		ولجد شیبی تحظی سنہ مکوران

(زمانہ نے ایک بار مجھے کم عمری میں دھوکا دے کر مصیبت سے دوچار کیا تھا، اور دوسری بار بوڑھا ہونے کے بعد اس نے دھوکا دیا، لہٰذا میری قسمت میں اس کی جانب سے دو فریب آئے)

وصار ربینی وبین الانس فی سفری		من بعد البابہ بالباب رومان

(پہلے لوگوں کا مجھ سے ایسا ربط ضبط تھا کہ لوگ دوران سفر ہجوم در ہجوم میرے دروازے پر حاضری دیا کرتے تھے)

فلا ارٰی من بکیل اوبنی جُشَمٍ		حولی غریبا ولا من ال رودان

(لیکن اب میں قبیلۂ بکیل، قبیلۂ بنو جشم یا یمن کے رودان نامی علاقے کے رہنے والوں کا کوئی اجنبی مسافر بھی اپنے گرد نہیں دیکھتا)

وکان لی یرجا ارجان ارجیۃ		فخیبت وبنابی روضُ ارجان

(ارجان نامی شہر کے اطراف سے میری امید وابستہ تھی، مگر گردش ایام نے اسے ناکام بنا دیا اور ارجان کے باغات میرے لئے ناخوشگوار بن گئے)

فصبرت مہما اردت السیر معترفًا		الجد إلی ارجان ارجانی

(کیونکہ جب بھی میں نے صبر و تحمل سے کام لیکر ایک سرگرم کوشش کرنے والے کی طرح ارجان ارادہ کیا تو زمانے نے میرے ارادے کی تکمیل کو میرے لئے موخر کر دیا)

ان کان غیری فی خفض فی دعۃٍ		یخلو بدفٍّ ومزمار وعیدان

(میرے علاوہ دوسرے لوگ عیش و عشرت میں ہیں، اور خلوت میں دف، بانسری، اور باجوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں)

فلی من الدھر فی یومی ولیلتہ		من التمدّد فی غیظو وعیدان

(لیکن میرے لئے زمانے کی طرف سے شب و روز میں غضبناک تہدید اور دو وعیدیں ہیں، ایک صبح کو اور دوسری شام کو)

وکنت من قبل لو ھمت بدائرۃ		صروف دھری علی حرٍّ انا الثانی

(اس سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ اگر زمانہ کسی شریف اور آزاد آدمی کو اپنی گردشوں کی

زد میں لانا چاہتا تو میں اس کا منھ پھیرنے والا ہوتا تھا)

فصاد سهمی فی شیبی و فی کبری　　و فی ارتعاشی بعد الاول الثانی

(اب زمانے میں میرا حصہ مستقل اور مسلسل مصائب ہیں، جو بڑھاپے، لاغری، اور مرض رعشہ کی صورت میں نازل ہوئے ہیں)

وکان لو صفرت کفای من نشب　　واحتجت افقرنی دهر و اعرانی

(ستم پرور زمانے نے میرے ہاتھوں کو مال و دولت سے خالی کر دیا، حالانکہ میں خود ضرورتمند تھا، پھر اس نے مجھے مزید مفلس بنایا اور عریاں کر دیا)

فالان اذ شکرت اخلاف میسرتی　　وارتشت افقرنی دهرٌ و اعرانی

(پہلے میں تو تونگر تھا، اور ہر طرح کی سہولت مجھے میسر تھی مگر اب منحوس زمانے نے انتقام لیتے ہوئے مجھے نادار بنا کر چھوڑ دیا)

اَمَرُّ عیشی ما قاسیت فی سفری　　من بعد ما کان حلاه وحلاّنی

(اپنی زندگی میں سب سے زیادہ تلخی مجھے سفر میں برداشت کرنی پڑی، حالانکہ زمانہ اس سے پہلے سفر کو خوشگوار اور دلچسپ بنا چکا تھا)

معطلاً جسمی الموهون منتقیا　　من بعد ما کان حلاه وحلاّنی

(اب وہ میرے نحیف و لاغر جسم کو بے کار کر چکا ہے، جب کہ پہلے اس نے اسے سنوارا سنوارا تھا، اور مجھے آراستہ کیا تھا)

دعاد قوتی کفا من نوی حشف　　وکان من صدر دراج وحُلّانی

(اب میری خوراک مٹھی بھر کھجور رہ گئی ہے، حالانکہ پہلے تیتر اور بکرے کے سینے کا گوشت میری خوراک تھی)

یا قرّتی عینی الماجدین ازتجلا　　یداً الی فلق ما سور نحلانی

(اے میری آنکھوں کی ٹھنڈک، شریف و دانا فرزندو! اگر تم میں ایک قیدی کو نجات دلانے کی طاقت ہو تو مجھے چھڑا لو)

فلست اُبصر فی نُبهی و فی سنتی　　حتیٰ سروج ولا اَبراج حرّانی

(کیونکہ مجھے بیداری اور خواب دونوں حالتوں میں سروج کی چراگاہ اور حرّان کے برج دکھائی نہیں دیتے)

لکن یدقّ قناهُ فی مُداعستی　　دهری وعاس شدید الطعن حرّانی

(لیکن اب باہمی نیزہ زنی میں بڑا ماہر اڑیل، پارہ پارہ کر دینے والا، اور رسوا کن زمانہ اپنے ظلم و ستم کے تیر میرے جسم پر توڑ رہا ہے)

من بعد ما ربّنی طولاً و اکرمنی　　قولاً واجزل لی نولاً وفتانی

(پہلے زمانہ نے مجھے بڑے ناز و نعمت سے پالا، زبان سے بڑا اکرام کیا، بڑے انعامات سے نوازا، اور مجھے طاقتور جوان بنایا)

حتّیٰ اذا صرتُ اخشی الذئب من کبری　　الاذنی بصفیق الوجه فتان

(یہانتک کہ جب میں اپنے بڑھاپے کی وجہ سے بھیڑیے سے بھی ڈرنے لگا، تو اس نے مجھے اپنے فتنہ انگیز چہرے کی پناہ میں لے لیا)

وما حنی منها غضر البحار بها　　منح الجواد بلا عدّ وحُسبانِ

(دنیا میں سمندروں کے پانی کی انتہائی زیادتی نے عطیات کی ایسی بارش نہیں کی ہوگی، جس طرح کہ سخی زمانے نے پہلے بے گنتی اور بے حساب داد و دہش کی تھی)

حتیٰ اذا وخط الشیب لقذ الرمی　　جوانحی بسا سبب وحُسبانِ

(یہانتک کہ جب بڑھاپے نے گدی کے بالوں کو کھچڑی بنادیا تو زمانے نے بڑوں اور چھوٹوں سے
میرے پہلوؤں کو چھلنی کردیا)

وکنت لو عضته لانت جوانبه   واختفی خنقه منه وارضانی

(پہلے اگر میں زمانے کو اس کے کرتوتوں کا بدلہ دیتا تو اس کے پہلو نرم ہو جاتے، اس کی عداوت
مجھ سے مخفی رہتی اور وہ مجھے رضامند رکھتا تھا)

فصرت اودض بالآصال مجتزیا   وبالغدو فکفلی منه ارضان[1]

(مگر اب یہ حال ہے کہ میں صبح و شام اس سے انتقام لینے کی تیاری کرتا ہوں تو مجھے اس کی جانب
سے دیمک زدہ دو زمینوں کا حصہ ملا ہے)

وکنت من قبل اودعته ھبا   کانما حاطه للحفظ برجان

(پہلے میں جس کے پاس بھی سونا بطور امانت رکھتا تو وہ ایسا محفوظ ہوتا کہ گویا دو برجوں نے حفاظت
کی خاطر اس کا احاطہ کر لیا ہے)

والآن کل من استودعته اھبا   أَلَصُّ من سارق العربان برجان

(اور اب ہر وہ شخص جس کے پاس میں کچا چمڑا امانت کے طور پر رکھتا ہوں تو وہ عربوں کے برجان
نامی چور سے بھی بڑا چور بن جاتا ہے)

وکنت احسب دھری نافلا وسنا   غمرا أغفل سنانی فل نبھان

(میں اپنے زمانے کو غافل، اونگھنے والا اور ناتجربہ کار سمجھتا تھا لیکن اس نے میرے بھالے کو
اس طرح بیکار بنا دیا جس طرح کہ نبھان بیکار بنا دیتا تھا)

لما رأی انتاط عن نصر ذافرتی   من آل حاتم الطائی نبھان

۱؎ تاریخ ثغر عدن ج ۲ ص ۵۵ تا ۵۸

(جب زمانہ بد نے حاتم طائی نبھانی کے خاندان کی طرف سے میرے اقارب و انصار کی مدد کو دیکھا
تو اس نے کسی سے مشورہ کئے بغیر اپنی رائے سے یہ سلسلہ منقطع کر دیا)

فقلت یا دھر سالمنی مسالمة   فاننی عمری تمر صاغانی

(تب میں نے کہا: اے زمانہ تو میرے ساتھ مصالحت کرلے کیونکہ میں حضرت عمر بن الخطاب کی اولاد
سے ہوں اور میرا وطن صغان ہے)

فانصاع ینقاد اذ عانا وسالمنی   ومد ظبعی وناغانی وصاغانی

(یہ سن کر وہ میرا سچا فرمانبردار بن گیا، اس نے مجھ سے مصالحت کر لی، میرے بازو دراز کر دیے، مجھ سے
قریب ہوا اور میری طرف ہمہ تن گوش ہوگیا)

فصار شکوای شکرا والجوی فرحا   والعتب عتبی وفادانی وناجانی

(اس لئے اب میرا شکوہ شکر سے اور غم خوشی سے بدل گیا، ناراضگی رضامندی میں تبدیل ہوگئی، اس نے
مجھ سے سرگوشیاں کیں، اور کہا کہ میں تجھ پر قربان)

وذاک للصفح منی عن جنایته   والصفح یجدی کثیرا ان جنی جان[1]

(یہ تبدیلی اس لئے ہوئی کہ میں نے اس کے ظلم و ستم سے درگذر کیا، اور گنہگار کے گناہ سے درگزر کرنا
بڑا فائدہ مند ہوتا ہے)

علامہ صغانی مدرسہ تتشیہ میں استاد مقرر ہو کر گئے، تو ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا اور تدریس
سے فارغ ہو کر برجستہ حسب ذیل اشعار پڑھے:-

فھا لحو یا ساداتی   منی دروسا عشرہ

فانتم معادن الفضل الکرام البررہ

ولست حبرا عالما   لکنہا مُحَبَّرہ

۱؎ تاریخ ثغر عدن ج ۲ ص ۵۵ تا ۵۸ -

فلتعذروا أخاكم فمثلكم من عذرا[1]

(میرے بزرگو! مجھ سے دس سبق پڑھ لو، آپ لوگ علم و فن کے مخزن، نیک اور شریف ہو، میں کوئی زبردست عالم نہیں ہوں لیکن یہ دس سبق عمدہ اور لکھے جانے کے لائق ہیں، تمہارا بھائی تم لوگوں سے عذر قبول کرنے کی درخواست کر رہا ہے، کیونکہ تم جیسے ہی لوگ معذرت خواہ کا عذر قبول کیا کرتے ہیں)

یاقوت رومی نے صراحت کی ہے کہ علامہ صغانی نے اپنی تصنیف "مناسک الحج" کو ان اشعار پر ختم کیا ہے،[2]

شوقی إلی الکعبة الغرا قد زادا فاستعمل القلص الوخادة الزادا

(معزز خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے میرا شوق بہت زیادہ ہو چکا ہے، اس لئے شتر مرغ کی مانند لمبی ٹانگوں والی تیز رفتار اونٹنیوں کو زادِ راہ کے طور پر استعمال کر)

اذاقت الحنظل العامی منتجعاً وغیرک انتجع السعدان وارتادا

(کیا تجھے عام تلخ اندرائن پسند ہے، حالانکہ تیرے علاوہ دوسرے اشخاص اونٹوں کا بہترین چارہ تلاش کر چکے)

انبت سرحل حتی آض عن کثب نیاقها رزحا والصعب منقاداً

(تو نے اپنے جانوروں کو تھکا دیا یہاں تک کہ اونٹنیاں لاغر ہو کر ریت کے ٹیلے سے واپس ہوئیں اور دشوار امر آسان بن گیا)

فاقطع علائق ما ترجوه من نشب واستودع اللہ اموالا واولادا

(تو توقع موانع یعنی غیر منقولہ جائداد یا مال و مویشی کی وابستگی کو ختم کر اور اموال و اولاد کی

---

[1] ماہنامہ معارف ۳۴، ص: ۱۶۹ و ۱۷۰، [2] معجم الادباء ۹-: ۱۸۹،

امانت اللہ کو سونپ دے)

علامہ سیوطی نے صغانی کی ایک مناجات کے درج ذیل پانچ اشعار نقل کئے ہیں،[1] ان میں لفظ المرتجی کو بطور قافیہ استعمال کیا ہے، اور ہر شعر میں جداگانہ معنی مراد لیا ہے، جیسا کہ ترجمہ سے واضح ہوتا ہے،

یاراحم الطفل الرضیع المزعج یافاتح الباب المنیع المرتج

(اے حقیر و مضطرب شیر خوار بچے پر رحم کرنے والے، اے محفوظ اور بند دروازے کے کھولنے والے)

ان کان غیری مبلسا مستیئساً فانا الفقیر المستکین المرتجی

(ممکن ہے کہ میرے علاوہ بھی کوئی شکستہ دل اور مایوس و نامراد ہو، مگر میں یقیناً فقیر، مسکین اور رحمت کا امیدوار ہوں)

او کان غیری آمناً فی سربه فان المتایخ المستجیر المرتجی

(یا ممکن ہے کہ میرے سوا کوئی شخص صرف اپنے خاندان میں مامون و محفوظ ہو، لیکن حقیقت میں کرم کا طالب وہ ہے جو پناہ کا متلاشی اور خائف ہو)

اشنانت الراحات عنی وانات یامن یقرب کل نائ مرتجی

(ہر طرح کا عیش و آرام ختم ہو چکا ہے، اور ہر ایک راحت دور ہو گئی آپ ہی ہر ایک بعید اور دشوار مقصد کو قریب کر دیتے ہیں)

انت الذی فیہ شفاء السقم لا قضب الذراریح ولا دواء المرتج

(آپ ہی ایسے امراض میں شفا عطا فرما سکتے ہیں جن کا علاج نہ زرنیخ کا نشکر کرتا ہے، اور نہ کوئی دوسری مفید دوا)

---

[1] بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ

واحکموا بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

حاکوا اباکم واحکموا عقدۃ الادب ترقوا مراقی یھواھا ذوو الرتب[1]

(اخلاق و عادات میں اپنے والد کے مشابہ ہو، اور ادب کی گرہ باندھو یعنی فنون ادب میں کمال حاصل کرو، تو تم لوگ بلندی کے ایسے زینوں پر چڑھ جاؤ گے جن تک پہونچنے کے لئے بڑے بڑے صاحبان قدر و منزلت خواہاں ہوتے ہیں)

اذا ما اتی رمضان فبتک جبال التوانی بموسی رمیضہ

(جب ماہ رمضان آجائے تو گرم و تیز استرے سے غفلت و کاہلی کے علاقوں کو منقطع کردو)

واعرض عن اللغو فی صومہ وقصر طوال الامانی العریضۃ

(رمضان کے روزوں میں لغویات اور غلط کام سے بچ، اپنی طویل و عریض امیدوں کو انتہائی کم اور مختصر بنا دو)

وامض الی الخیر فیہ وشم مجدا البرق المعالی ومیضہ

(ماہ صیام میں نیک اعمال پر برابر نظر رکھو، اور کوشش کر کے عظمت و رفعت کی برق کی چمک کو پیش نظر رکھو)

وشد علی غرصۃ الاعتمار فقد ایبس العمر روضا عریضہ

(زندگی کے معرکۂ کارزار میں نیک اعمال کے ذریعہ تیزی سے گامزن ہو جاؤ کیونکہ طویل اور بے عمل زندگی نے وسیع باغ کو بھی خشک کر دیا یعنی باقی ماندہ زندگی کو غنیمت سمجھو، اور آخرت کے لئے زاد و راہ حاصل کرو)

[1] پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کے پاس بوڈلین لائبریری کے ایک مخطوطہ نمبر 107

وصاحب ارنضیا حصیفا رضیٰ وردمث لجنبک ارضا اریضہ

(خوش اخلاق، متواضع، صائب الرائے اور پختہ عقل والے کے ساتھ دوستی کرنا اور اس کے ساتھ وقت گذارنا پسند کرو، شاداب اور زرخیز زمین کو اپنے پہلو کے لئے نرم بنا، یعنی استراحت کو ترک کر کے اس ماہ مبارک میں عبادت کر)

وایقن بانک فی فرصۃ الممات فبادر فوات الفریضۃ

(یقین رکھ کہ تجھے موت نے ابھی موقع دیا ہے لہذا خوب دھیان رکھ کہ فرائض میں سے کوئی فرض بھی فوت نہ ہونے پائے)

واقرض لفقرک قبل الرحیل فقد أنشد الموت فیک قریضہ

(دار بقا کو رحلت سے قبل اپنے مال سے ضرورتمندوں کی اعانت کر تاکہ آخرت میں تو تہی دست نہ ہو کیونکہ موت نے تیرے بارے میں اپنا شعر پڑھ دیا ہے یعنی بزبان حال فنا کا اعلان کر دیا ہے)

ولکن جھلت اعاریضہ واحببت حبا شدیدا عروضہ

(لیکن تو اس کے اشعار کے اوزان سے ناواقف ہے، حالانکہ علم عروض سے تیرا بہت گہرا تعلق ہے)

وما ان تحض علی طاعۃ وتنزل من کل خیر حضیضہ

(ایک طرف تو اپنے آپ کو اطاعت پر نہیں اکساتا ہے، اور دوسری طرف ہر ایک بھلائی میں پست مقام ہی پر ہوتا ہے)

(وانقض ظھرک عبا المعاصی وقد اسمع الصوت منہ نقیضہ

(معاصی کے بار نے تیری پشت کو بوجھل بنا دیا ہے، جب کہ موت نے اپنی جانب سے مخالف فیصلے کی خبر محکم طریقہ سے سنا دی ہے)

واعجبک النخل عند الانّاض وعفت من التخصی کبراً انیضه

کھجور کے متغیر ہونے اور اس کے فاسد ہونے پر تجھے تعجب ہے، اور تو نے جسیم ہونے کے بعد بڑھاپے کی بگڑی ہی حالت کو مکروہ سمجھا، یعنی بوڑھا ہونے پر فطری تغیرات اور لاغری ضروری امور ہیں، لہذا پہلے ہی خدا کی اطاعت کی جائے، اور آخرت میں کامیابی کے لئے عبادت کیجائے۔

علامہ کا حسب ذیل قصیدہ اپنی نوعیت کا پہلا قصیدہ ہے جس کو اردو میں منتقل کرنا دشوار ہے۔ طویل تشریح کے بعد ہی اس کی وضاحت ممکن ہے۔ اس لئے صرف عربی اشعار پر نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، یہ قصیدہ درج ذیل تین حصوں میں منقسم ہے:-

۱۔ خدا کی حمد و ثنا اور رسولؐ کی نعت کے بعد یہ صراحت کی ہے کہ طلبہ کو یاد کرانے کے لئے قرآنی سورتوں کی تعداد آیات کو نظم کی صورت میں پیش کیا گیا ہے چونکہ آیات کی تعداد میں اہل کوفہ کا مسلک مشہور و معروف ہے۔ لہذا اسی کو اختیار کیا گیا ہے، اور سورتوں کا ذکر حساب جمل یعنی ابجد و ہوز کے قواعد کے تحت ترتیب وار بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ عموماً ہر مصرعۂ شعر میں ایک ایک سورت کو ترتیب سے ذکر کیا ہے،

۳۔ صحیح تعداد جاننے کے لئے فنِ حساب کے تین قاعدے تحریر کئے ہیں، ان میں سے کسی بھی قاعدے پر عمل کر کے آیات کی صحیح تعداد معلوم ہو سکتی ہے۔

الحمد لله العلی الاحد — القادر الفرد الولی الصمد

ملجأ کل مشفق شرید — وامن کل خائف وحید

. . . .

. . . .

جلّ عن الاشباه والانداد — والمثل والاکفاء والاضداد

ثمّ صلوٰة الله والتحیه — تحیة زاکیة سنیه

علی الذی اسری به رب الوری — فوق السموات الرفیعات العلی

محمد خیر الانام طراً — ارفعهم قدراً واعلی ذکراً

ولعبد قال ضعیف ملتجی — الی صلاح کل من یجی

شرفها الله واعلی قدرها — کما جلا للمومنین امرها

اردت نظم عدد الآیات — علی التوالی مشرف الایات

وکان ترتیب حساب الجمل — اُولی واحری بالصبی المستهل

فخضت فیه طلب التسهیل — مقرباً فیه طریق القیل

مراعیاً عدة اهل الکوفه — فانها مشهورة معروفه

وقلت العون من الخلاق — علی احتیاز قصب السباق

~~~~~~~~~~

فاتحة الکتاب زاد وقبا — وتلوها راق فهید أدقبی

وآل عمران رسول ونبی — وفی النساء وجه قرم عربی

واحسب قری کثیر للمائدة — وتلوها قفت سلیمی حاجة

وسورة الاعراف رمنا وطنا — وسورة الانفال عدهندونا

وتلوها قد کان طیر وقفص — ویونس طاب قراه ونخص

وهود حثت تادیا کتابه — ویوسف یا اخوتی قرابه

والرعد جرش ملک وادمله — وتلوها نصیل بذ ادمجمله
~~~~~~~~~~

والحجر صاد طائراً وادربنا — والنحل قد كل حما دى وكبا

سبحان مثل يوسف فى العدد — والكهف يروى قرظيا وبدى

ومريم صاد حبا دى وطفر — طه لقد قد هبيب دهبر

والانبياء يا قد يوب بين — وسورة الحج عدو حسن

والمومنون حرقلبى يلتهب — والنور ساد دائماً وماتعب

وسورة الفرقان زدت غا — والشعراء زاد روح كاشرا

والنمل صدق جعفراً قنص — واحتسب قد بيت حاد للقصص

والعنكبوت سلا طاقى ومضى — والروم سر وجح فالعمر انقضى

سورة لقمان لعثمان - د مى — وسورة السجدة لى الحكم

وسورة الاحزاب عمر جنى — وفى سبا نادى دواد ودنى

وفاطر هم ملكوا واسجوا — ليس جد فوجه وانجحوا

والزاجرات فاق بكر قتما — وص فض حليه واقتما

واحتسب هونك للزمر — وتلوها فارق هراك واصبر

وسورة السجدة دار نافع — وسورة الشورى نداء جامع

وسورة الزخرف طيب فاحا — وفى الدخان طا وعوانصاحا

واحتسب زوال لبة للجاثيه — وسورة الاحقاف هذى لاغيه

سورة ختم الانبيا محمد — حلى لعمرى وذكا زعسجد

وسورة الفتح لهدى كثجاوزل — والحجرات جل يحيى وارتحل

ق هذا مرتعى ومرتعى — والذاريات نشره وشرعى

والطور ما عوطاهر وعنتر — والنجم بات ساهراً وقد عرى

وعد هدى نافع للقمر — وسورة الرحمن عقل الحبر

وعد صدق واهياً للواقعه — والحديد كلهن طائعه

واحسب بلدت كسابا للمجادلة — والحشر كف دعه وعادله

والامتحان جوهر يلتمع — والصف دق يا سر ومربع

واحسب امام دير قدى للجمعه — ومثلها المنافقون ملمعه

وعد يا حاذم للتغابن — بهز يصيد للطلاق البائن

ومثلها فى سورة التحريم — والملك لهو وفساد الحيم

ون باب نافع والحكم — وتلوها كمثلها فاغتنم

مال وجذر يعدلان عددا — لك طريق فاحفظن مجتهدا

نصف فربع عدد الجذور — واضمم اليه جملة المذكور

ثم خذ الجذر من الكل وحط — نصف الجذور فاحفظنه وحط

وان يكن يعدل مال وعدد — جذراً فنصف ثم ربع ما ورد

ثم اطرح ذا العدد المعينا — وخذ لباقى المال جذراً بينا

وانقصه من نصف الجذور (اوزد) — عليه يخرج ما سئلت فاجتهد

وان يكن يعدل جذر وعدد — مالا فنصف ثم ربع للرشد

وزد على ذا العدد المربعا — فجذره ونصف اجذار معا

جواب هذا السائل الممتحن — صديقه ونظمه للحسن

عہد نبویؐ میں اسلامی ریاست کا نظامِ تعلیم

از

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی ریڈر ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، پاکستان

یہ مضمون پاکستان کی ایک سیرت کانفرنس منعقدہ ۱۷، ۱۸؍ فروری ۱۹۸۲ء کے لئے لکھا گیا تھا، مگر مقالہ نگار کی عدم شرکت کی وجہ سے وہ پڑھا نہ جا سکا، اب اسے معارف میں شائع کیا جا رہا ہے۔

(اصلاحی)

کسی بھی سوسائٹی، ہیئت اجتماعی یا نظامِ حکومت میں تعلیم کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، کسی مخصوص معاشرہ میں کس قسم کی تعلیم کا اہتمام ہوتا ہے، یہ موقوف ہے اس پر کہ وہ معاشرہ کس قسم کے نظریۂ حیات کا علمبردار ہے، دنیا اور اس کی زندگی کے بارے میں اس کے تصورات کیا ہیں، اس کی اقدار، اس کے معیارات، اس کی اولیات اور ترجیحات کیا ہیں، تعلیم کے معنی سکھانا، مطلق سکھانا، اس لئے بذات خود تعلیم کی اپنی کوئی اہمیت نہیں ہے، اہمیت اس کی ہے کہ سکھاتے کیا ہیں، گویا اصل شے تعلیم نہیں نصاب تعلیم ہے، وہ باتیں ہیں جو سکھائی جائیں، رہا مطلق سکھانے کا عمل، تو یہ انسان کا کوئی مابہ الامتیاز عمل بھی نہیں، اس میں انسان اور جانور دونوں برابر ہیں، شیر اپنے بچے کو شکار کرنا سکھاتا ہے، اس کو کم کسی نے دیکھا ہوگا، مگر کتا بلی تو عام پالتو گھریلو جانور ہیں، ایک کتیا یا بلی اپنے نومولود بچے کو اس کے کام کی باتیں کس طرح سکھاتی ہے، اس کا مشاہدہ ہم میں سے اکثر نے کیا ہوگا، بلی اپنے بچوں کو جو کچھ سکھاتی ہے وہ اس کی برادری کے نقطۂ نظر سے، شیرنی اپنے بچوں کو جو کچھ سکھاتی ہے وہ اس کے برادری کے نقطۂ نظر سے کتنا اہم ہے، مگر اسی عمل

کو ایک چوہے یا ہرن کے نقطہ نظر سے دیکھئے تو وہ نہ صرف غیر اہم بلکہ حد درجہ ناپسندیدہ بلکہ گھناؤنا فعل نظر آئے گا، بعینہ اسی طرح کی صورت حال عالم عالم انسانی میں پائی جاتی ہے، انسانوں کا ایک گروہ یا طبقہ جس عمل کو حسن شمار کرے گا دوسرا گروہ اس کو بدترین تصور کرے گا۔

دنیا میں تعلیم یا زیادہ صحیح یہ کہ نصاب تعلیم کے جو تصورات انسانوں نے بطور خود اپنے جبلی تقاضوں کے تحت اپنی حیوانی یا انسانی ضروریات کی تکمیل کے لئے قائم کئے، ان کی نسبت مختلف گروہوں اور طبقات کے درمیان اختلاف رائے کا ہونا ممکن ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے، اور اس میں ایک گروہ یا طبقہ دوسرے گروہ یا طبقے کو یا ایک فرد دوسرے فرد کو طاقتور ہونے کے ناطے جبر و تشدد کے ذریعہ تو خاموش کر سکتا ہے، لیکن اسکے پاس تفوق اور برتری کی ایسی کوئی دلیل نہیں جس کو چیلنج نہ کیا جا سکے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ تمام علوم و فنون جو ابتک انسان نے اپنی فطرت اور جبلت کی اندرونی تحریک سے ایجاد کئے، اور ان کو دنیا میں پھیلایا، ہم ان کو علی الاطلاق خیر و صلاح اور فوز و فلاح کا ضامن قرار نہیں دے سکتے، ان کا حسن و قبح ان کے محل استعمال سے مشروط ہے، لیکن خود حسن و قبح کا فیصلہ اگر مجرد عقل و علم انسانی پر چھوڑ دیا جائے تو پھر وہی سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ معیار اور حَکَم کس کو تسلیم کیا جائے اور اس باب میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی وجہ کیا ہوگی، ترجیح بلا مرجح کی صورت میں راجح اور مرجوح کے درمیان توافق ہم آہنگی پیدا کرنا ممکن نہیں، توافق اور ہم آہنگی کے فقدان کا دوسرا نام فساد ہے، انسانی علم نے ماضی کی نسبت بہت ترقی کر لی ہے، لیکن اس سے انسانی معاشرہ میں صلاح کی بجائے فساد کو فروغ ہوا ہے اور آج دنیا "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ" کا جو منظر پیش کر رہی ہے، وہ سب کے سامنے ہے، اگر انھیں علوم کو فروغ دینا انبیاء کا مشن بھی ہوتا تو ان کا مقصد بعثت نعوذ باللہ فساد فی الارض ہی قرار پاتا، جس کی توقع آتش پرستوں کے خدا اہرمن سے تو ہو سکتی ہے، جو ان کے نزدیک شر کا خالق ہے، لیکن اللہ رب العالمین سے نہیں ہو سکتی جو کہ رؤف و رحیم اور رحمان و کریم ہے۔

اس طویل تمہید کا مقصد اس حد فاصل کی نشاندہی کرتا ہے جو انبیاء کی تعلیم اور عام تعلیم کے درمیان بنیادی فرق کی حیثیت سے موجود ہے۔ جو لوگ اس فرق کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتے غلط مبحث کا شکار ہو کر راستے سے بھٹک جاتے ہیں، دانستہ یا نادانستہ غلط نتائج اخذ کرتے ہیں، خود گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں، اس کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ علم انسانی کی مسحور کن ترقی نے بہت سے کم نظر مسلمانوں کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے یا کسی مصلحت اور ضرورت کے تحت وہ ناگفتنی باتیں کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

نظام تعلیم میرا موضوع ہے عہد نبویؐ میں اسلامی رسالت کا نظام تعلیم، دقت نظر سے کام لیکر دیکھا جائے تو عہد نبویؐ میں نہ کوئی ریاست تھی نہ نظام تعلیم، ہاں تعلیم تھی، فقط تعلیم، ریاست اور نظام وغیرہ آجکل کی اصطلاحیں ہیں اور ان کا اپنا ایک تصور ہے، ان کو ہم اس دور سعادت آثار کے احوال و ظروف اور معاملات و مسائل پر اگر منطبق کریں، جن کی کوئی نظیر نہیں ہو سکتی، کہ وہ اپنی نظیر آپ تھے، تو ہمیں بڑے اندیشے ہیں، اس کا نتیجہ وہی ہو گا جس کا ذکر اقبال نے کیا ہے

حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ امت روایات میں کھو گئی

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس دور میں ریاست نہیں تھی تو پھر کیا تھا۔ جواب یہ ہے کہ نبوت تھی صرف نبوت، اور نبوت کے بعد خلافت علی منہاج النبوۃ۔ اس کی جگہ ریاست، سلطنت، حکومت، بادشاہت اور جمہوریت وغیرہ الفاظ گمراہ کن ہیں، اس عہد کی جو تاریخ جس رنگ میں بھی ہم تک پہنچی ہے اس میں "ریاست" اور "نظام" جیسی کوئی چیز نظر نہیں آتی، "تعلیم" کا لفظ بھی نہیں ملا مگر یعلمکم الکتاب والحکمۃ[۱]" "بعثت معلما[۲]" "خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ[۳]" کی موجودگی میں یہ نتیجہ نکالنا غلط معلوم نہیں ہوتا کہ تعلیم تھی، ضرور تھی۔ مگر آج کی طرح نہیں۔ آج کی طرح نہ اسکول اور کالج تھے اور نہ آج کی طرح یونیورسٹیاں تھیں نہ ٹیچر اور پروفیسر تھے، اس لئے تعلیم کے مثبت نتائج اور ثمرات تھے، آج کی طرح تباہی اور بربادی نہیں تھی فساد اور بگاڑ نہیں تھا، بقول اکبر

۱۔ وہ پیغمبر تم لوگوں کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے ۲۔ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں ۳۔ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن سیکھے اور اسے سکھائے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اس لئے میں موضوع پر روشنی ڈالنے کے لئے اس عہد کی تعلیم سے متعلق سیدھے سادے الفاظ میں بعض واقعات اور حقائق کا ذکر آج کل کی گمراہ کن اصطلاحات کا سہارا لئے بغیر کروں گا، کم سواد خامکار نوجوان ترنگ میں آکر اس قسم کی نادانیاں کر جاتے ہیں، میں اس سے عمداً احتراز کروں گا، ایک جگہ میں نے کہیں مضمون میں لکھا ہوا پڑھا، مضمون نگار نے غالباً عہد نبوی میں طب اور حفظان صحت کے موضوع پر خامہ فرسائی کی تھی، غزوات میں ازواج مطہرات اور صحابیاتؓ کی ہنگامی نوعیت کی معمولی مصروفیات کا ذکر کر کے انھوں نے تان اس پر توڑی تھی کہ وہ آجکل کی باقاعدہ تربیت یافتہ نرسیں تھیں، العیاذ باللہ۔ عہد رسالت کی ان محترم، پاک اور مقدس ہستیوں کا تصور کیجئے اور موجودہ ہسپتالوں کی پیشہ ور نرسوں کا تصور کیجئے، اور پھر آج کل کی اسکالرشپ اور دانشوری پر سر پیٹ لیجئے۔

آنحضورؐ حامل کتاب پیغمبر تھے - الم - ذالک الکتاب لاریب فیہ۔ آپ کو الکتاب کی تعلیم کے لئے بھیجا گیا، یعلمھم الکتاب۔ آپ کا مشن لوگوں کو قرآن کی تعلیم دینا تھا، اس لئے آپ نے لوگوں کو قرآن پڑھایا اور اپنے پیروکاروں کو بھی یہی تلقین فرمائی۔ خیرکم من تعلم القرآن وعلمہٗ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس نے قرآن پڑھنا سیکھا اور سکھایا۔ اس حدیث میں لفظ قرآن کو پڑھنے کے معنی میں لے کر اس سے مجرد علم یا تعلیم کی اہمیت ثابت کرنا سطحیت ہی نہیں زیغ اور کج فہمی بھی ہے، یہ تعبیر منشائے دین سے ہم آہنگ نہیں اور تفسیر بالھویٰ کے زمرے میں آتی ہے، قرآن اور حدیث میں مسلمانوں کو جس تعلیم کی تاکید کی گئی ہے وہ علم دین اور قرآن کی تعلیم ہے اور بس، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ عہد نبویؐ میں آنحضورؐ نے بعثت سے لیکر وصال تک جس چیز کی تعلیم کا اہتمام فرمایا، وہ قرآن اور صرف قرآن ہے، مسلمانوں کے پاس بحیثیت مسلمان کے پڑھنے کے لئے اس وقت تک اور کچھ تھا ہی نہیں، مقصود بالذات یہی تھا۔ اس کے بعد اگر کچھ اور سیکھنے سکھانے اور پڑھنے پڑھانے کا کہیں سراغ ملتا ہے تو وہ بطور مددگار

اور معاون علوم وفنون کے، مثلاً سب سے پہلے جب کتاب اللہ کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے کتابت کی ضرورت پیش آئی تو لوگوں نے لکھنا سیکھا۔ اس طرح لکھنا بھی گویا مسلمانوں کی تعلیم کا ایک جزو قرار پایا، اسی طرح خطوط، فرامین اور معاہدات کے لئے بھی فن تحریر کو سیکھنے اور سکھانے کی ضرورت ہوئی۔

وراثت کی تقسیم اور لین دین کے معاملات کے لئے تحریر کے ساتھ حساب کی بھی ضرورت ہوئی تو اس کی تعلیم بھی دینے دلانے کا سلسلہ شروع ہوا، قرآن نے ہدایت کی ہے کہ قرض کے لین دین کو، رقم چھوٹی ہو یا بڑی لکھ لیا کرو۔ اذا تدا اینتم بدین . . . . الخ (البقرہ ۲۸۲) اب ظاہر ہے اس حکم خداوندی کی تعمیل جب تک لکھنا نہ آئے کس طرح ہو سکتی ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ قرآن لکھنا پڑھنا سکھانے کے لئے نازل ہوا تھا، درست نہیں، لکھنا پڑھنا دنیا میں نزول قرآن سے پہلے بھی تھا۔ قرآن رشد وہدایت کے لئے نازل ہوا، آنحضورؐ قرآن کی تعلیم کے لئے مبعوث فرمائے گئے، آپ کے بعد یہ فرض آپ کی امت کو تفویض ہوا۔ قرآن اور علم دین کی تعلیم فرض عین قرار پائی جو ہر مسلمان مرد اور عورت کے لئے لازمی تھی، باقی علوم وفنون کے بارے میں صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ وہ حسب ضرورت ثانوی درجے میں بطور فرض کفایہ عہد نبویؐ کے مسلمانوں کی تعلیم کا حصہ تھے، عہد نبویؐ کی تاریخ کے مطالعے سے جس کے دو ماخذ قرآن اور حدیث ہیں، یہی معلوم ہوتا ہے۔

قرآن کو لوگ کس طرح پڑھتے پڑھاتے تھے۔ پتہ چلتا ہے کہ تعلیم کے دونوں ہی ذریعے استعمال کئے جاتے تھے، یعنی سینہ بہ سینہ زبانی بھی اور کتابت وتحریر کے ذریعہ بھی، جن میں پہلا طریقہ کتابت کی عملی دشواریوں کی وجہ سے زیادہ عام تھا، عہد نبویؐ میں حدیث اور فقہ کو ایک علیٰحدہ علم یا فن کی حیثیت حاصل نہ تھی، باقی منطق فلسفہ اور علم کلام کا ذکر ہی فضول ہے، اس لئے ان کے سیکھنے سکھانے کا سوال بھی خارج از بحث ہے، البتہ دینی احکام اور مسئلے مسائل کا سکھانا چونکہ خود آنحضورؐ کی زندگی کا مشن تھا، اس لئے آپ

کی اتباع میں آپ کے ساتھی بھی اس کا اہتمام کرتے نظر آتے ہیں، اس کو فقہ کی تعلیم سے تعبیر کرنا غلطہائے مضامین کے قبیل سے ہے۔ ؎

غلطہائے مضامین مت پوچھ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

فقہ کی تعلیم کا جو تصور آج عربی مدارس یا جامعات میں ہے کہ فقہ رہ گئی ہے اور فقہ جس سے ماخوذ تھی یعنی قرآن وہ غائب ہے۔ اس طرح کی فقہ کا سراغ ہمیں عہد نبویؐ کے سلسلہ تعلیم وتعلم میں کہیں نہیں ملتا، اس کے علاوہ بھی متعدد علوم وفنون کے سیکھنے سکھانے کا سراغ ملتا ہے، لیکن فرض عین اور فرض اولین کی حیثیت سے نہیں بلکہ فرض کفایہ کی حیثیت سے، اس سے فقط اتنا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام حسب ضرورت ان کے سیکھنے سکھانے سے مانع نہیں ہے، مثلاً عہد نبویؐ کے آثار میں یہ باتیں ملتی ہیں کہ قرآن وسنت کے علاوہ لوگ نشانہ بازی، پیراکی، حساب، طب، علم ہیئت، علم انساب اور قرأت وتجوید بھی سیکھتے سکھاتے تھے، لیکن ظاہر ہے ان کا سیکھنا سکھانا اس درجہ کا نہیں تھا جس درجہ میں کہ قرآن کے سیکھنے سکھانے کا حکم تھا، زندگی اور تہذیب وتمدن سے متعلق وہ علوم جو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ان کے بارے میں صحیح اور متوازن نقطہ نظر یہی ہے کہ اسلام کی مقرر کردہ دینی اور اخلاقی حدود میں رہ کر ان کا حصول جائز ہے۔ مثلاً زراعت یا حصول معاش کے دوسرے طریقے جو دنیا میں پہلے سے رائج ہیں، اسلامی معاشرہ میں بھی ان کو کچھ پابندیوں کے ساتھ اختیار کیا جائیگا اسلام اس سے مانع نہیں ہے، لیکن اس کو اگر یہاں تک بڑھا دیا جائے کہ اسلام زراعت سکھانے کے لئے آیا اور قرآن اصول زراعت کی کتاب ہے تو اس کی لغویت میں کلام نہیں، اسلام اس کے نبی اور قرآن کا مقصد وجود اس طرح کے علوم وفنون نہیں ہو سکتے، زراعت اور پیداوار ہی کے کسی مسئلہ سے متعلق اس کا ذکر آتا ہے کہ آپ نے جواب میں فرمایا:

انتم اعلم بامور دنیاکم تم اپنی دنیا کے امور کو بہتر سمجھ سکتے ہو۔

اس حدیث کے الفاظ سے قطعیت کے ساتھ یہ ثابت ہوتا ہے کہ امور دنیا سے متعلق علوم و فنون سے آپ نے سروکار نہیں رکھا۔ لیکن مسلمانوں کو ان کے حصول سے منع بھی نہیں فرمایا۔ بلکہ اس کے برعکس حسب ضرورت ان کے حصول کی طرف توجہ دلائی، لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ کی بعثت ان علوم و فنون کی تعلیم کے لئے تھی، آج کے مسلم معاشروں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ ایک طرف تو انھوں نے ان علوم کو پس پشت ڈال دیا ہے جن کی تعلیم کے لئے آپ مبعوث ہوئے اور قرآن نازل ہوا۔ خود قرآن زبان حال سے فریاد کناں ہے:

يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (فرقان ۳۰)
خدایا انھوں نے قرآن کو چھوڑ رکھا ہے۔

دوسری طرف ہم نے تعلیمی میدان میں اپنے جملہ وسائل کو سائنس اور ٹکنالوجی کی تحصیل پر لگا رکھا ہے، اس طرح ہم بھی بحیثیت مجموعی دنیا کی بہت سی قوموں میں سے ایک قوم بن کر رہ گئے ہیں، وہ بھی پست اور پسماندہ، جبکہ ہمارا اصل مقام اقوام عالم کی صف میں ان کے دوش بدوش رہنا نہیں بلکہ ان کی امامت کرنا تھا، اور یہ منصب ہمیں اسی وقت مل سکتا تھا جب ہم اپنے مقصدِ وجود سے باخبر ہوتے اور اس کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرتے، ہمارا مقصد وجود کیا تھا قرآن نے اس کو بہت صراحت اور وضاحت سے بیان کر دیا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران ۱۱۰)
تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کے لئے نکالے گئے ہو، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

مسلمانوں کو خیر الامم کا لقب دے کر ان کو اقوام عالم سے ممیز ہی نہیں کیا گیا بلکہ یہ بھی جتا دیا گیا

کہ یہ امت عالم انسانیت کے لئے برپا کی گئی اور اس کی ذمہ داری یہ قرار پائی کہ وہ معروف کا حکم دیگی اور منکر سے روکے گی، اس بار امانت کا تحمل ہونے کے بعد مسلمانوں کے پاس اتنا وقت کہاں آئیگا کہ وہ دنیا کے دوسرے کاموں میں مصروف ہوں، مسلمان اپنے فرائض منصبی سے غافل نہ ہوں تو ان کو دنیوی ترقی میں سر کھپانے کی ضرورت ہی نہیں۔

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران: ۱۳۹)
تم سربلند رہوگے اگر تم مومن رہوگے۔

یہ دنیا مومن کی میراث ہے، وہ اس کی چاکری کرے گی، لیکن وہ اپنے مقام سے ہٹے تو ذلت و خواری ان کا مقدر ہوگی جیسا کہ سب کے سامنے ہے۔

آنحضورؐ کی تعلیم یا نظام تعلیم جو چاہے کہہ لیجئے اس کا بنیادی نقطہ یہی تھا کہ آپ نے اپنے عہد کے مسلمانوں کو تشخص اور امتیازی حیثیت کا شعور دلا کر ایک عظیم مقصد اور بلند نصب العین کے لئے مرنا جینا سکھایا۔ یہی نکتہ:

اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (انعام: ۱۶۳)
بیشک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور موت اس اللہ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے

میں بیان ہوا ہے جو ایک مومن کا وظیفہ ہے، آج سائنس اور ٹکنالوجی کا ہوا مسلمان معاشروں میں اس لئے پھونکا جا رہا ہے تاکہ وہ اس میں پھنس کر رہ جائیں اور اس علم کی طرف متوجہ نہ ہوں جو ان کا مابہ الامتیاز ہے اور اس طرح باطل پرست اقوام کی امامت اور سرپرستی، سیادت اور بالادستی قائم رہے، اور مسلمان جن سے ان کو خطرہ ہے بدستور ان کی غلامی اور چاکری کرتے رہیں، ائمہ کفر اور ضلالت کے قائدین نے مسلمانوں ہی کو سحر سامری سے اپنی بندگی میں نہیں لے رکھا ہے بلکہ انھوں نے

پوری انسانیت کو غلام بنا رکھا ہے، اور وہ ان کے سامنے کوس لمن الملک الیوم بجا کر انا ربکم الاعلیٰ کا نعرہ لگاتے ہیں۔ راقم نے آج کی دنیا میں رائج دونوں ہی نمائندہ نظاموں کو دیکھا ہے۔ میں چین میں بھی رہا ہوں اور امریکہ میں بھی، ہر دو جگہ انسانیت سسک سسک کر دم توڑ رہی ہے، وہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں

رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ	خداوندا تو ہمیں اس بستی سے نکال جس کو
الظَّالِمِ اَهْلُهَا (نساء: ۷۵)	رہنے والے ظالم ہیں۔

مگر وہ امت جس کو دنیا کا نجات دہندہ بنا کر بھیجا گیا تھا خود اسی حالت میں گرفتار ہے ع

مژدہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

ضرورت ہے کہ ہم سب سے پہلے عہد نبویؐ کے تصور تعلیم کو دیانت داری کے ساتھ اس کی اصل اور خالص و منزہ شکل میں اپنائیں۔ اس کا علم حاصل کریں اور اس پر کاربند ہوں۔

معارف: مقالہ نگار کا یہ منشا نہیں ہے کہ مسلمان سائنس، ٹکنالوجی یا موجودہ دنیاوی علوم و فنون کی تحصیل ہی نہ کریں بلکہ وہ انھیں مقصود بالذات بنا لینے کی نفی و تردید کرنا چاہتے ہیں، اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جس چیز کی تعلیم دینے کے لئے ہوئی تھی اسی کی تعلیم و تحصیل پر انھیں اصلاً اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیئے، اور اسی میں ان کی زندگی اور سربلندی کا راز پنہاں ہے ع

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

وہ اس پر بھی زور دینا چاہتے ہیں کہ خیر امت کو اپنے اصل مقصد کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیئے، اگر اس نے بھی یورپ ہی کی طرح خالص مادی نقطۂ نظر کو اپنا لیا اور نئے علوم کی تحصیل کے درپے ہو کر کتاب و سنت کی تعلیم سے کوئی سروکار نہیں رکھا تو اس کا نتیجہ خود اس کی ذلت اور دنیا کی تباہی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

مطبوعات جدیدہ

کاروانِ زندگی: مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۱۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳۵ روپیے، ناشر مکتبۂ اسلام ۳۷ گوئن روڈ، لکھنؤ۔

یہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے خود نوشت حالات ہیں، اس میں انھوں نے اپنے بچپن ۱۹۱۵ء سے ۱۹۶۵ء تک کے حالات و واقعات زندگی اٹھارہ ابواب میں قلمبند کیے ہیں، سب سے پہلے اپنے خاندان اور بستی دائرہ شاہ علم اللہ کا تذکرہ کیا ہے، تاکہ اس ماحول کی تصویر سامنے آجائے، جس میں ان کی نشو و نما ہوئی ہے، پھر لکھنؤ میں قیام، وہاں کے ماحول، اپنی تعلیم و تربیت اور عربیت کی مشق و ممارست کا حال لکھا ہے، اس سلسلہ میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقیات اور ندوۃ العلماء میں تحصیل علم کے علاوہ لاہور میں مولانا احمد علیؒ کے درس قرآن اور دیوبند میں مولانا حسین احمد مدنیؒ کے درس حدیث میں اپنی شرکت کا تذکرہ کیا ہے، اور مندرجۂ ذیل اساتذہ سے خاص طور پر استفادہ کا ذکر کیا ہے، شیخ خلیل عرب، خواجہ عبدالحیؒ فاروقی، مولانا سید طلحہ، اور علامہ تقی الدین ہلالی، اسی حصہ میں اپنے والد محترم کے انتقال پا جانے کے بعد اپنے بزرگ اور شفیق بھائی ڈاکٹر حکیم مولانا سید عبدالعلی کے سایۂ عاطفت اور سرپرستی کا بڑی احسانمندی سے ذکر کیا ہے، جس نے انہیں شفقت پدری سے محرومی کا احساس نہ ہونے دیا، تعلیم کے مراحل ختم کرنے کے بعد ندوۃ العلماء میں اپنی معلمی کی سرگذشت بیان کی ہے، اس میں درس کے لیے اپنی

محنت، تیاری، لگن اور اس سلسلہ کی ضروری کارگذاریوں اور خدمات کی جو تفصیل لکھی ہے، وہ آج کل کے سہولت پسند اساتذہ کے لیے سبق آموز ہے، اس ضمن میں نصاب کی جدید ترتیب کے لیے مختلف کتابیں اور ریڈریں خود مرتب کرنے اور دوسرے اساتذہ سے مرتب کرانے کا ذکر بھی آگیا ہے، اس کے بعد ندوۃ العلماء سے باہر کے اشخاص، اداروں اور جماعتوں سے اپنے روابط کی داستان سنائی ہے، اس سلسلہ میں مختلف اداروں کے دعوت ناموں اور وہاں کی گئی اپنی تقریروں کا ذکر کیا ہے، اسی حصہ میں جماعت اسلامی سے تعلق اور علاحدگی اور ایک زمانہ میں تبلیغی جماعت سے اپنی وابستگی اور اس کے اجتماعات میں حصہ لینے کا تذکرہ کیا ہے، مولانا کا اصلی ذوق دعوتی اور تبلیغی ہے، اصلاح خلق، خدمت دین، اشاعت اسلام، اعلائے کلمۃ اللہ اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے جو ولولہ، جوش، تڑپ اور بے قراری ان میں پائی جاتی ہے وہ اس پوری کتاب میں بہت نمایاں ہے، اس کے لیے انھوں نے ملک و بیرون ملک کے جو اہم، پر از مشقت اور یادگار سفر کیے، اس کی روداد بھی اس میں درج کی ہے، عربی زبان میں دعوتی لٹریچر کی تیاری اور مشرق وسطیٰ کا سفر بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، مولانا کا اصلاحی و دعوتی دائرہ مسلمانوں ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ وہ غیر مسلموں کو بھی اسلام کا پیغام پہنچانے کے لیے بے چین رہتے ہیں، اس کتاب میں ایسے مخلوط اجتماعات کی روداد اور عنفوان شباب میں ڈاکٹر امبیدکر کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے اپنے بمبئی تشریف لے جانے کا تذکرہ کیا ہے، مولانا کو تصنیف و تالیف کا فطری ذوق اور تقریر و خطابت کا خداداد ملکہ ہے، اس آپ بیتی میں اپنی اکثر کتابوں کا مقصد و پس منظر بتا کر ان کا مکمل تعارف کرایا ہے، اور اپنے خطاب اور مختلف اہم تقریروں کا خلاصہ بھی افادۂ عام کے لیے درج کیا ہے، انہیں خود اپنی اصلاح کی فکر بھی برابر دامن گیر رہتی ہے، اس کے لیے متعدد اہل اللہ اور مشائخ کی خدمت میں

اپنی حاضری کا ذکر کیا ہے، ان کی فرط شہرت، مقبولیت اور عظمت کی بنا پر انہیں بڑے سے بڑے اعزاز ملے، دمشق اور مدینہ کی یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے مدعو کیے گیے، اور ہندوستان اور عالم اسلام کے عظیم الشان اداروں اور اکیڈمیوں کے ممبر بنائے گیے، اس کتاب میں ان کی اور اپنی قومی، ملی، تعلیمی اور دینی سرگرمیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، ان کا حلقۂ تعارف بڑا وسیع ہے، جس میں مختلف طبقوں کے مشاہیر اور دنیائے اسلام کی ممتاز شخصیتیں شامل ہیں، ان سب کا حسب موقع اس کتاب میں ذکر آگیا ہے، اس طرح یہ آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں ہے، جو گذشتہ نصف صدی کے متعدد واقعات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بڑی دلچسپ اور سبق آموز ہے،

محی الملۃ والدین، مرتبہ مولانا شاہ عون احمد قادری، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۲۵ مجلد مع گردپوش، قیمت ۲۵ روپے، پتہ، دار الاشاعت خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ،

مولانا شاہ محمد محی الدینؒ کا تعلق پھلواری کے اس خانوادہ سے ہے، جو کئی پشتوں سے علم و عرفان کا گہوارہ ہے، خود مولانا کی ذات بھی علم و عمل اور شریعت و طریقت کی جامعیت میں اپنے اسلاف کا نمونہ تھی، اور وہ اپنے والد بزرگوار مولانا شاہ بدر الدینؒ کے بعد خانقاہ مجیبیہ کے سجادہ نشین اور امارت شرعیہ بہار کے امیر ہوئے، اس کتاب میں ان کی مذہبی اور ملی خدمات، کی تفصیل پیش کی گئی ہے، اور ان کے خاندانی حالات، ظاہری و باطنی تعلیم و تربیت، علمی کمالات اور اخلاق و سیرت کے جلوے نمایاں کیے گیے ہیں، اور ان کے آل و اولاد اور خلفاء و مسترشدین کا حال بھی تحریر کیا گیا ہے، اس کا پہلا اڈیشن مولانا کے انتقال کے بعد ہی شایع ہوا تھا، یہ دوسرا اڈیشن ہے، اس میں بھی تعزیتی خطوط اور قطعات تاریخ درج ہیں،

شروع میں مرتب کے فرزند مولوی شاہ نصر احمد کے علاوہ مولانا مناظر احسن گیلانی کا عالمانہ مقدمہ بھی ہے، اس میں بہار کی تاریخی و علمی اہمیت اور پھلواری اور خانقاہ مجیبی کی دینی خدمات اور نمایاں خصوصیات تحریر کی گئی ہیں،

خطبات عیدین: مرتبہ مولانا محمد تقی امینی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۶۰ مجلد، قیمت ۲۱ روپے، پتہ:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی،

مولانا محمد تقی امینی ناظم شعبۂ دینیات سنی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے یونیورسٹی سے وابستہ ہونے کے بعد وہاں کی جامع مسجد میں جمعہ اور عیدین کے خطبوں کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے، جو اب بھی جاری ہے، مکتبۂ جامعہ نے ان کے عیدین کے خطبوں کا یہ مجموعہ اپنی طباعت کے روایتی معیار کے مطابق شایع کیا ہے، ان میں اسلامی تہوار کے خط و خال، عیدین کی اہمیت و خصوصیت اور ان کے مخصوص اذکار و اعمال کی غرض و حکمت بتائی ہے، اور عید الفطر کے ضمن میں روزہ سے اسکا تعلق واضح کیا ہے، اور عید الاضحیٰ کے سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کی سرگذشت بیان کی ہے، فاضل خطیب نے ذکر و خشیتِ الٰہی، انابت الی اللہ، قلب و روح کی پاکیزگی، انفاق، قربانی، ایثار، مواسات، ہمدردی، اخوت اور مسلمانوں کی تہذیبی و معاشرتی اصلاح وغیرہ کو عیدین کی اصل روح اور خاص تعلیم بتا کر ان کی بڑی موثر وضاحت کی ہے، مگر سب خطبوں کا موضوع ایک ہی ہونے کی وجہ سے ان میں اعادہ و تکرار ہے، نیز یہ خطبے خواص اور تعلیم یافتہ طبقہ کے مجمع میں دیئے گئے ہیں، اس لیے ان میں انھی کے ذوق کو مد نظر رکھا گیا ہے۔

میر باقر مخلصؔ مرشد آبادی: مرتبہ ڈاکٹر عبد الرؤف صاحب، متوسط تقطیع

کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۰۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۸ روپے، ناشر مغربی بنگال اردو اکیڈمی ۱۷ سندری موہن ایونیو، کلکتہ نمبر ۱۴۔

مرشد آباد (بنگال) بھی اردو کا ایک بڑا مرکز تھا، جو آخری دور میں دلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ اور عظیم آباد کی طرح شعراء اور ارباب کمال کی منزل بنا ہوا تھا، یہاں کے بعض قدیم سخنور میرؔ، سوداؔ، دردؔ اور جانجاناں کے معاصر ہی نہیں، ان کے ہم پایہ بھی تھے، میر باقر مخلص اسی عہد کے ایک باکمال شاعر تھے، ان کی پیدائش بھی مرشد آباد میں ہوئی، اور وہ یہیں پیوندِ خاک بھی ہوئے، لیکن ان کا دیوان نایاب تھا جس کا صرف ایک ہی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ تھا، جو بڑے خراب اور خستہ حال میں تھا، اب اسی کی مدد سے ڈاکٹر عبد الرؤف ریڈر شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی نے مخلص کا دیوان ایڈٹ کرکے اپنے مقدمہ کے ساتھ شایع کیا ہے، یہ در اصل ان کا وہ مقالہ ہے جس پر کلکتہ یونیورسٹی نے ان کو ڈی لٹ کی ڈگری دی ہے، اس میں مخلص کے نام و نسب اور سنہ پیدائش کے متعلق عرق ریزی سے بحث کرکے بعض تذکرہ نگاروں کے غلط بیان کی تصحیح کی ہے، ایک باب میں میر باقر کے عہد کے حالات کا جائزہ لیا ہے، پھر اردو اور فارسی تذکروں میں ان کے بارہ میں جو مواد درج ہے، اسے سلیقہ سے جمع کرکے حواشی میں تذکروں اور ان کے مولفین کے متعلق ضروری معلومات قلمبند کیے ہیں، ایک باب میں مرشد آباد کی اہمیت و مرکزیت واضح کرنے کے بعد وہاں کے مخلص کے ہمعصر شعراء کا مختصر تذکرہ لکھا ہے، اور ان کے کلام کا نمونہ بھی دیا ہے، اس کے بعد مخلص کے دور کی لسانی خصوصیات اور ان کے کلام کے بعض متروکات کی نشاندہی کی ہے، آخر میں مخلص کا دیوان دیا ہے، جو قصائد، غزلیات اور ساقی نامہ پر مشتمل ہے، اس میں بھی کہیں کہیں مفید حواشی درج ہیں، مخلص اساتذۂ فن میں تھے، قدامت کے باوجود ان کا کلام بلند پایہ اور درد

غالب کے دواوین کی طرح انتخاب معلوم ہوتا ہے، اسلیے اسکی اشاعت ایک مفید ادبی خدمت ہے، جس کے لیے مغربی بنگال اردو اکیڈمی مبارکباد کی مستحق ہے، لائق مرتب نے محنت اور دیدہ وری سے مخلص کے کلام کا جائزہ لے کر ان کی جن خصوصیات کی نشاندہی کی ہے، اس سے ان کے عمدہ ذوق اور اچھی تنقیدی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے،

تواریخ ریسلاس۔ شہزادہ حبش، مرتبہ ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۸۰، مجلد مع گردپوش، قیمت ۳۵ روپے، پتے: (۱) انجمن ترقی اردو، اردو گھر، راؤز ایونیو، دہلی (۲) دانش محل، امین آباد پارک، لکھنؤ۔

یہ انگریزی ناول "دی ہسٹری آف ریسلاس پرنس آف ابی سینیا" کا اردو ترجمہ ہے، جسے سید کمال الدین حیدر المعروف بہ سید محمد میر لکھنوی نے آگرہ اسکول بک سوسائٹی کی فرمائش پر کیا تھا، اور ۱۸۳۹ء میں چھپا تھا، مگر اب نایاب تھا، اسلیے ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی لکچرر شعبۂ اردو شبلی کالج نے اس کا متن دوبارہ اپنے مقدمہ و حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے، مقدمہ نگار نے مصنف ڈاکٹر سیموئل جانسن کی ناول نگاری کی خصوصیات اور اس ناول کے قصہ، پلاٹ اور دوسرے ضروری معلومات قلمبند کیے ہیں، انھوں نے مترجم کے خاندانی حالات اور دوسرے واقعات کی کافی چھان بین کی ہے، آخر میں میر صاحب کے علمی و ادبی کارناموں اور انکی تصنیفات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے، اور زیر نظر ناول کے ترجمہ کی خصوصیات اور اس کی زبان و طرز بیان پر اظہار خیال کیا ہے، مرتب کے خیال میں یہ انگریزی ناول کا پہلا اردو ترجمہ ہے، جو اصلاح خلق کے علاوہ اس جذبہ سے کیا گیا ہے کہ اہل ہند مغربی علوم و افکار سے واقف ہوں، اس لحاظ سے یہ اہم ہے، لائق مرتب کے مفید اور معلومات پر مشتمل مقدمہ سے اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے، انھوں نے ناموں اور مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی آخر میں دی ہے، مگر کتاب کا نام تاریخ ریسلاس ہونا چاہیے، خود مترجم نے بھی یہی نام لکھا ہے۔ "ض"